سب موسموں کا ساتھی ہو

وہ یونہی چولہے میں دبی راکھ کرید کرید کر اُس میں چنگاریاں ڈھونڈ رہی تھی۔ گو کہ اب اُسے چولہا نہیں جلانا تھا اور نہ ہی باورچی خانے میں اب کوئی کام تھا لیکن یہ شاید اس کا دل پسند مشغلہ تھا کہ وہ رات میں باورچی خانہ بند کرنے سے پہلے اس طرح راکھ کریدنے لگتی تھی۔ کہیں کہیں سے کوئی چنگاری لپکتی یا کوئی بجھتا ہوا کوئلہ اچانک ہوا ملتے ہی پھر سے جلنے لگتا تو اُس کی آنکھیں یوں چمکنے لگتیں۔ جیسے اُس نے کسی ملبے کے ڈھیر سے کسی زندہ انسان کو کھینچ نکالا ہو اور اب اُسے زندگی کی طرف لوٹتے دیکھ رہی ہو۔ کبھی کبھی ایسا ہوتا کہ کوئلہ پورا جل اُٹھتا اور کبھی یوں ہوتا کہ یہاں میں راکھ ہو جاتا۔ اور ابھی تک تو ایسا تھا کہ ہر دو صورتوں میں اس کی کیفیت ایک ہی رہتی۔ نہ خوش نہ افسردہ۔ بس ایک ذرا سا شوق۔ کوئلہ جل اُٹھتا تو شوق سے دیکھتی اور وہ بجھ کر راکھ ہو جاتا تو اُٹھ کر اندر چلی جاتی۔

''چل آ چھوری!'' اندر سے اماں پکار رہی تھیں۔

''آئی امّاں!'' اس نے وہیں سے جواباً کہا پھر ہاتھ میں پکڑی لکڑی چولہے کے نیچے رکھ کھڑی ہو گئی۔ پہلے ادھر ادھر کا جائزہ لیا۔ کہیں کوئی کام رہ تو نہیں گیا۔ پھر اپنا اطمینان کر کے باورچی خانے کا دروازہ بند کرتے ہوئے اندر آ گئی۔ امّاں حسبِ معمول کپڑوں کے چھوٹے چھوٹے چوکور ٹکڑے کاٹ کر انہیں جوڑنے میں مصروف تھیں۔ اور بابا سائیں اپنی چارپائی پر نیم دراز ادھر ادھر کی باتیں بلکہ ایک طرح سے خبریں سنا رہے تھے۔

''آگ اچھی طرح بجھائی تھی؟'' اسے دیکھ کر امّاں اس کی طرف متوجہ ہو گئیں۔

''ہاں!'' وہ طاق پر سے قاعدہ اور سلیٹ اٹھا کر اپنی چارپائی پر آ بیٹھی۔ تو بابا سائیں قدرے حیرت سے پوچھنے لگے۔

''ارے چھوری! تجھے پڑھنا آتا ہے۔''

''نہیں۔'' اس نے پہلے نہیں کہا پھر کہنے لگی۔ ''علی مراد نے تھوڑا تھوڑا سکھایا ہے۔''

''علی مراد نے!'' بابا سائیں کے ساتھ امّاں بھی ہنسنے لگیں۔ پھر اسی طرح ہنستے ہوئے بولیں۔

''اُس چھورے کو تو ابھی خود پڑھنا نہیں آتا۔ تجھے کیا پڑھائے گا۔''

''اُسے پڑھنا آتا ہے اماں! اور لکھنا بھی۔'' وہ یقین سے بولی۔ ''پانچویں جماعت میں پڑھتا ہے۔ اور دیکھ اُس نے مجھے بھی لکھنا سکھایا ہے۔'' اُس نے جلدی سے سلیٹ پر دو تین لفظ لکھ کر سلیٹ اماں اور بابا سائیں کی طرف موڑ دی۔

''کیا لکھا ہے یہ؟'' اماں اور بابا سائیں نے پہلے ایک دوسرے کو پھر سلیٹ اور پھر اُسے دیکھا۔

''اللہ ایک ہے۔'' اس نے فخریہ بتایا پھر کہنے لگی۔ ''علی مراد کہہ رہا تھا۔ میں بہت جلدی پڑھنا لکھنا سیکھ جاؤں گی۔''

''بس کر۔'' اماں نے فوراً ٹوک دیا۔ ''کوئی ضرورت نہیں ہے تجھے پڑھنے لکھنے کی۔ برادری میں کوئی اور چھوری پڑھی ہے جو تو پڑھے گی۔''

اس نے بابا سائیں کی طرف دیکھا اور انہیں اماں کی بات پر سر ہلاتے دیکھ کر بہت خاموشی سے قاعدہ پڑھی ہے جو تو پڑھے گی۔''

وہ فطرتاً صلح جو تھی یا کمزور اور بزدل کہ کسی بات سے اختلاف نہیں کرتی تھی۔ ویسے ابھی اس کی عمر بھی زیادہ نہیں تھی۔ یہی کوئی چودہ پندرہ سال۔ اور اس عمر میں لڑکیاں عموماً والدین کی بات مان لیا کرتی ہیں۔ اس نے بھی بغیر کسی بحث کے قاعدہ اور سلیٹ رکھ دی تھی۔

اگلے دن وہ اماں کے ساتھ بیٹھی رلیاں جوڑ رہی تھی لیکن اس کا دھیان مسلسل بیرونی دروازے کی طرف تھا۔ وہ جانتی تھی علی مراد روزانہ کی طرح اسکول سے واپسی پر پہلے اس کے گھر آئے گا۔ اور کل اسے جو سبق پڑھا کر گیا تھا اس کی بابت سوال کرے گا کہ آیا اس نے

یاد کیا یا نہیں۔ اور ہو سکتا ہے، اماں نے پہلے غور نہ کیا ہو لیکن اب وہ ضرور علی مراد کو ٹوکیں گی۔

اس نے سوچا۔ ایسا نہ ہو، اماں کے ٹوکنے سے علی مراد اسے پڑھانے کا خیال چھوڑ دیے۔ جبکہ وہ ایسا نہیں چاہتی تھی۔ اس نے اماں کے سامنے قاعدہ رکھ ضرور دیا تھا۔ لیکن پڑھنے سے توبہ نہیں کی تھی۔ پھر وہ کوئی بہت زیادہ نہیں بس اتنا چاہتی تھی کہ اپنی مرضی سے پڑھ اور لکھ سکے۔ مرضی سے مراد جو چیز ہاتھ آ جائے۔ پڑھ لے اور جو لکھنا چاہے لکھ لے۔ اگر وہ ذرا سی سمجھ دار ہوتی تو شاید اماں کو سمجھانے کی کوشش کرتی، لیکن ابھی اس کے اندر صرف ڈر تھا کہ اماں سختی سے منع کر دیں گی اور وہ کبھی نہیں پڑھ سکے گی۔ اس لیے وہ چاہتی تھی۔ علی مراد کو خود ہی کسی طرح سمجھا دے کیونکہ وہ ابھی بچہ تھا۔ پہلے جس کی بات سنتا اسی کی مانتا۔

"میں روٹی ڈال دوں اماں!" وہ اسی بہانے اماں کے پاس سے اُٹھ کر باورچی خانے میں آ گئی۔ پھر جیسے ہی علی مراد دروازے سے داخل ہوا۔ اس نے اشارے سے اپنے پاس بلا لیا۔

"یہاں بیٹھ جا، ابھی روٹی پک جاتی ہے، کھا کر جانا۔" اس نے پیڑھی اس کے سامنے رکھ دی۔ جب وہ بیٹھ گیا تو آواز دبا کر سرگوشی میں کہنے لگی۔

"سن، اماں اور بابا سائیں مجھے پڑھنے سے منع کر رہے ہیں۔"

"کیوں ادی؟"

"پتا نہیں اور وہ تجھے بھی کہیں گے کہ مجھے مت پڑھا۔"

"نہیں پڑھاؤں گا۔" وہ لاپروائی سے بولا۔

"نہیں علی مراد!" وہ منت سے بولی۔ "بس تھوڑا سا اور پڑھا دینا لیکن اماں اور بابا سائیں کو پتا نہ چلے۔"

"ٹھیک ہے۔" وہ سہولت سے مان گیا تو وہ خوش ہو گئی۔ اس کے پھولے پھولے گال پر چٹکی کاٹتے ہوئے بولی۔

"تو بہت اچھا ہے علی مراد!"

"ادی! تم بھی مجھے بہت اچھی لگتی ہو۔ اور میں نے اماں سے کہا ہے، میں تم سے شادی کروں گا۔"

"کیا؟" وہ پہلے حیران ہوئی پھر ہنس پڑی۔

پھر علی مراد کی کوشش سے زیادہ اس کی لگن کو دخل تھا کہ بہت جلد اس نے پڑھنا سیکھ لیا۔ اماں سے چوری بابا سائیں سے چھپ کر وہ علی مراد کی لائی ہوئی چھوٹی چھوٹی کہانیوں کی کتابیں پڑھا کرتی۔ جن میں شہزادے شہزادیوں کے قصے ہوتے اور وہ..... نو عمر لڑکی انجانے میں اپنے آس پاس ایک نئی دنیا سجا بیٹھی۔ ساعتوں میں سفید براق گھوڑے کی ٹاپیں اور آنکھوں میں اس ماورائی مخلوق کے سپنے جو کسی بھی آواز پر پیچھے مڑ کر نہیں دیکھتا کہ کہیں پتھر کا نہ ہو جائے اس کے برعکس سارے جنوں کا خاتمہ کر کے شہزادی کو قید سے رہائی دلاتا ہے پھر اس کے ساتھ شادی کر لیتا ہے۔

پہلے وہ یونہی کچھ دیر راکھ سے کھیلا کرتی تھی۔ اب گھنٹوں دبی ہوئی چنگاریوں کو ہوا دینے لگی تھی۔ ساتھ ساتھ اس کی کیفیات بھی بدلتی گئی۔ کبھی خوش ہوتی۔ کبھی افسردہ۔ گو کہ ابھی دونوں کا مفہوم اس پر واضح نہیں ہوا تھا۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ وہ اچانک خوش کیوں ہو جاتی ہے یا پھر ایک دم اس کا دل بجھ کیوں جاتا ہے۔

پھر کتنے بہت سارے دن گزر گئے۔ علی مراد ذرا سا سیانا ہوا تو اسے دوسری کتابیں لا کر دینے لگا۔ جن کو پڑھ کر جہاں وہ شہزادے، شہزادیوں کے تصور سے نکلی، وہاں اس پر شعور و آگہی کے در کھلنے لگے تھے۔ جس سے اس کا تجسس یوں بڑھا کہ وہ بے چین رہنے لگی۔ پتا نہیں کس چیز کی کھوج تھی اسے کہ آنکھیں ہر دم متلاشی رہتیں۔ بظاہر تو سب کچھ ٹھیک ٹھاک تھا۔ گھر کی فضائیں بھی ویسی ہی تھیں۔ بابا سائیں کی محبت میں کمی تھی نہ اماں کی، پھر بھی پتا نہیں کیوں تشنگی کا احساس ہوتا تھا۔ اور ابھی وہ اندر کی تشنگی کا راز جان بھی نہ پائی تھی کہ اس کے ماما، مامی اس کے لیے علی مراد کا رشتہ لے کر آ گئے۔

اس کی برادری میں یہ کوئی انہونی یا معیوب بات نہیں تھی۔ اس سے پہلے اس کی خالہ زاد اور چچا زاد بہنوں کی شادی اپنے سے آدھی عمر کے لڑکوں کے ساتھ ہوئی تھی۔ لیکن اس روز اس پر ادراک ہوا کہ کوئی سوچے نہ سوچے لیکن وہ ضرور اپنے لیے الگ انداز سے سوچنے لگی ہے۔ اس کی بے نام سی بے چینی اس بات کی غماز تھی کہ وہ اندر ہی اندر ایسی، ہی کسی صورت حال سے خوفزدہ تھی۔

"اماں!" وہ اماں کی گود میں سر رکھ کر رو پڑی۔ "ابھی تو علی مراد بہت چھوٹا ہے۔"

"ابھی چھوٹا ہے ناں۔ ہمیشہ تو چھوٹا نہیں رہے گا۔" اماں نے یوں جواب جیسے انہیں

اس کا ایسی بات کرنا ناگوار گزرا ہو۔

''ٹھیک ہے۔ نہ وہ بڑا ہوگا لیکن اس وقت تک میں بوڑھی ہو جاؤں گی۔'' یہ سمجھ اسے کتابوں نے دی تھی ورنہ اس سے پہلے کسی لڑکی نے ایسی بات اگر سوچی بھی تھی تو زبان سے نہیں نکالی تھی۔

''کیوں بوڑھی ہوگی۔ ابھی تیری عمر ہی کیا ہے۔''

''صرف میری عمر مت دیکھو اماں! علی مراد کو دیکھو۔ پورے سات سال چھوٹا ہے مجھ سے۔''

''تو کیا ہوا!'' اماں اطمینان سے بولیں۔ ''شادو کا میاں تو اس سے دس سال چھوٹا ہے۔ اب دیکھو کیسا گھبرو جوان نکلا ہے۔ اور شادو اس کے سامنے کوئی بہت بڑی تو نہیں لگتی۔''

''لیکن اماں!''

''بس کر چھوری!'' اماں نے ٹوک دیا۔ ''اب تو اپنے بیاہ کی بات کرے گی۔ تیرے بابا سائیں نے سن لیا تو تیری زبان کھینچ لے گا۔''

وہ حیران ہو کر دیکھنے لگی۔ ہر دم واری صدقے ہونے والی اماں کیسی کٹھور بن گئی تھیں۔ اس نے بے دردی سے اپنی آنکھیں رگڑیں اور ان کے پاس سے اٹھ گئی۔

پھر جب اماں ہی نے اس کی بات سمجھنے سے انکار کر دیا تو اور کون تھا۔ جس سے وہ کہتی۔ چپ چاپ سر جھکا دیا لیکن اندر ہی اندر وہ بُری طرح ٹوٹنے لگی تھی۔ ابھی تو اس نے پوری طرح اُن سپنوں کی آبیاری بھی نہیں کی تھی جو چپکے چپکے پلکوں میں اُترنے لگے تھے اور نہ چاہنے اور چاہے جانے والے جذبے کی شدتوں کو پا سکی تھی کہ اس سے پہلے ہی سب راکھ ہو گیا۔

''زینب شاہ!'' حسب عادت چولہے میں سے راکھ کریدتے ہوئے وہ اپنے آپ سے کہہ رہی تھی۔

''اب عمر بھر تمہیں یونہی راکھ ہونا ہے اور کوئی نہیں آئے گا، اس راکھ میں چنگاریاں کریدنے۔''

''اڈی!'' علی مراد کے پکارنے پر وہ چونک کر اُسے دیکھنے لگی۔ وہ کچھ اُلجھا اُلجھا سا

کھڑا تھا۔

''کیا بات ہے؟'' وہ سر جھکا کر پوچھنے لگی۔ تو وہ وہیں چوکھٹ پر بیٹھتے ہوئے بولا۔

''پتا ہے۔ میرے اماں ابا کیا کہہ رہے ہیں؟'' اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ کن اکھیوں سے اسے دیکھتے ہوئے نفی میں سر ہلانے لگی۔

''وہ تیری میری شادی کی بات کر رہے ہیں اور اماں!''

''اوئی!'' دبی ہوئی راکھ میں سے کہیں چنگاری اس کی انگلی کو چھو گئی تھی۔ ہونٹوں سے سسکی کی آواز نکلی اور اس نے انگلی کو دانتوں میں دبایا۔

''کیا ہوا؟'' وہ پریشان ہو کر پوچھنے لگا۔

''کچھ نہیں۔''

''دکھاؤ۔ تمہاری انگلی جل گئی ہے۔''

''نہیں۔'' اس نے ہاتھ پیچھے کر لیا تو وہ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد کہنے لگا۔

''یہ سب تیری اور میری شادی کی بات کیوں کر رہے ہیں۔ تم تو میری اڈی ہو اور مجھ سے بڑی بھی۔''

''میں تمہاری اڈی نہیں ہوں۔'' وہ بھیگے لہجے میں بولی۔

''پھر کیا ہو؟''

''پتا نہیں۔ اب تم جاؤ یہاں سے۔''

''نہیں۔'' وہ ضدی لہجے میں بولا۔ ''پہلے کہو تم میری اڈی ہو۔''

''اس سے کیا ہوگا۔''

''میں تم سے شادی نہیں کروں گا۔ تم بڑی ہو مجھ سے۔''

وہ حیران ہو کر اُسے دیکھنے لگی پھر تلخی سے بولی ''جا کر ماما، مامی سے کہو۔ مجھ سے کیوں اُلجھتے ہو۔''

''تم نے پھوپھی سے کیوں.....نہیں کہا؟''

''میری بات کوئی نہیں سنتا۔'' وہ بے بسی سے بولی اور اٹھ کر جانے لگی تو وہ اس کا دوپٹا پکڑ کر برابر کھڑا ہو گیا۔

''دیکھو، میں تم سے کتنا چھوٹا ہوں۔''

"ابھی چھوٹے ہو پھر بڑے بھی تو ہو گئے۔"

اس نے اماں کی بات دہرائی پھر اس کے ہاتھ سے اپنا دوپٹا کھینچ کر اندر چلی آئی۔ آنکھوں میں ڈھیرا سارا پانی جمع ہو گیا تھا۔ اس نے پلکیں جھپک جھپک کر سارا پانی اپنے اندر اُتار لیا۔ اب اُسے یہی تو کرنا تھا۔

پھر سکینہ کی زبانی اسے معلوم ہوا کہ علی مراد رو رو کر فریاد کرتا رہا تھا کہ وہ اس سے شادی نہیں کرے گا لیکن ابھی وہ اتنا بڑا نہیں تھا کہ وہ اپنی بات منوا سکتا یا کہیں بھاگ جاتا۔ مجبوراً اس کے ساتھ نکاح کے بندھن میں بندھ گیا۔

اگر تین بار ہاں کہلوا۔ دینے سے یا دُلہن بن جانے سے شادی ہو جاتی ہے تو اس کی بھی شادی ہو گئی تھی اور وہ اماں کے گھر سے نکل کر ماما، مامی کے گھر آ گئی۔ علی مراد جو پہلے ماموں زاد تھا اور بلا جھجک اس کے پاس آ جاتا تھا اب شوہر بن کر تو اس کے سائے سے بھی بدکنے لگا تھا۔ وہ ایک روٹھا ہوا بچہ نظر آنے لگا تھا۔ ہر وقت جھنجھلایا ہوا سا جیسے مرضی کے خلاف کوئی بات ہو جانے پر۔ اس کی سمجھ میں نہ آ رہا ہو کہ کیا کرے۔ گھر والوں سے تو تڑاخ سے بات کرتا اور اسے دیکھتے ہی راستہ بدل لیتا۔ جیسے سب کے ساتھ ساتھ وہ بھی قصوروار ہو۔

یہ صورتِ حال اس کے لیے نہ ہی پریشان کن تھی اور یہ ہی تکلیف دہ۔ بلکہ اُسے تو سرے سے کوئی غرض ہی نہیں تھی کہ وہ علی مراد کے رویے کو سوچتی۔ البتہ اپنے ساتھ ہونے والی زیادتی اُسے بہت رُلاتی تھی کیونکہ وہ عمر کے اس دور میں داخل ہو چکی تھی جب دل کی زم زم زمین پر کونپلیں پھوٹتی ہیں تو سارے احساسات ایک کے بعد ایک انگڑائیاں لینے لگتے ہیں۔ خود اپنی چوڑیوں کی کھنک چونکاتی ہے تو ہونٹوں کی کلیاں الگ چٹکنے کو بے تاب۔ بس اشارا چاہیے اور اشارے کی تلاش میں غیر ارادی طور پر اس کی نظریں بھٹکتی ہوئی اس پر جا ٹھہرتیں جو آنکھیں بند کیے بڑی زور زور سے ہل ہل کر سبق یاد کر رہا ہوتا۔ اور کبھی کبھی تو اُسے لگتا۔ اس کے ہلنے کی رفتار کے ساتھ ہی گھڑی کی سوئیاں بھی بھاگنے لگی ہیں۔ وقت تیزی سے سرک جاتا اور اس کی جگہ ایک مضبوط و توانا مرد سامنے آ جاتا جس کے اشارے اسے گدگداتے تھے کہ وہ ہنس پڑتی اور ایک روز وہ یونہی ہنس رہی تھی کہ کوئی چیز اس کے منہ پر آ گری۔ اس نے گھبرا کر دیکھا۔ علی مراد نے کتاب اُسے کھینچ ماری تھی۔

اور غصے میں کھڑا کہہ رہا تھا۔

"تم میرا مذاق اُڑاتی ہو۔"

"نہیں۔" وہ بس اسی قدر کہہ سکی اور وہ منہ ہی منہ میں پتا نہیں کیا کچھ بکتا ہوا باہر نکل گیا۔

پھر کتنے بہت سارے دن گزر گئے۔ علی مراد نے آٹھویں کا امتحان پاس کیا۔ مامی ..... نے کہنا شروع کر دیا کہ بہت پڑھ لیا۔ اب اپنے ابا کے ساتھ جا کر کھیتوں میں کام کیا کر۔ پہلے کچھ دن وہ خاموشی سے سنتا رہا پھر ایک دن چیخ پڑا۔

"مجھے نہیں کرنی وڈیروں کی نوکری۔ جو ہمیں جانوروں سے بدتر سمجھتے ہیں۔"

"پھر کیا کرے گا؟" مامی بھی چلا کر پوچھنے لگیں۔

"میں شہر جاؤں گا۔" وہ شاید شروع ہی سے تھوڑا باغی تھا۔

"شہر میں تو جیسے تیرے لیے محل کھڑے ہیں۔"

"نہیں کھڑے تو میں خود کھڑے کر لوں گا۔"

"دیکھ رہے ہو مراد کے ابا!" مامی نے فوراً ماما کو مدد کے لیے پکارا تو وہ سمجھانے کے انداز میں کہنے لگے۔

"بٹ شہر میں تو اتنے پڑھے لکھے لوگوں کی نوکری نہیں ملتی۔"

"مجھے ابھی نوکری نہیں کرنی۔ میں ابھی بہت سارا پڑھوں گا۔ اس کے بعد نوکری کا سوچوں گا۔" وہ اطمینان سے بولا۔

"میرے پاس تیری پڑھائی کے لیے خرچہ نہیں ہے۔" ماما نے اسی وقت صاف جواب دے دیا۔ لیکن وہ اپنے ارادے کا پکا تھا۔

"نہیں چاہیے مجھے خرچا۔ میں خود مزدوری کر لوں گا لیکن پڑھوں گا ضرور۔" وہ حتمی انداز میں بولا تو ماما مایوسی سے کہنے لگے۔

"جانے دو اسے۔ خود ہی دھکے کھا کر واپس آ جائے گا۔" وہ دندناتا ہوا کمرے سے چلا گیا اور اس تمام عرصے میں وہ پہلی بار اس کے پیچھے آئی اور پہلی بار اُسے مخاطب کیا۔

"علی مراد! کیا سچ مچ تم جا رہے ہو؟"

"ہاں کیوں" اس کا لہجہ بگڑا بگڑا تھا۔

"شہر تو بہت بڑا ہوتا ہے اور تم۔" وہ خاموش ہوگئی۔ کیا کہے اُس سے کہ تم ابھی چھوٹے ہو۔

"دیکھو او....." وہ اوّلی کہتے کہتے رُکا اور بے حد جھنجھلا کر بیگ میں اپنے کپڑے رکھنے لگا۔ وہ چپ چاپ اُسے دیکھتی رہی۔ جب وہ بیگ بند کر کے سیدھا ہوا تب پوچھنے لگی۔

"واپس کب آؤ گے؟"

"کبھی نہیں۔" اس کا جواب غیر متوقع ضرور تھا لیکن تکلیف دہ ہرگز نہیں وہ اطمینان کا سانس لیتے ہوئے وہیں بیٹھ گئی۔ اور اسے جاتے دیکھ کر دل ہی دل میں بولی۔

"جاؤ علی مراد! تمہارا اللہ حافظ۔ میرے لیے تنہا زندگی گزارنا زیادہ آسان ہے بہ نسبت تمہارے ساتھ کے۔"

اور یہ ٹھیک تو تھا۔ وہ کیسے سیج پر بیٹھ کر ایک طویل مدت کا اس انتظار کرتی رہے اور وہ اس وقت آتے جب اس کے اندر کی ساری چنگاریاں راکھ ہو کر ہوا میں بکھر چکی ہوں۔ وہ کہاں کہاں اس راکھ کو ڈھونڈتی پھرے گی کہ شاید اس میں کوئی چنگاڑی ہاتھ آجائے جو اس کے خوابیدہ جذبوں کو دہکانے کا سبب بنے۔

"چھوری! تو نے اسے روکا نہیں۔" مامی اس پر بگڑتے ہوئے آگئیں تو وہ ایک دم سنبھل کر کھڑی ہوگئی۔

"بہت روکا پر نہیں رُکا۔" اس نے مصلحتاً جھوٹ بولا۔

"واپسی کا کب بولا؟" اس کا دل چاہا اُسی کی طرح صاف کہہ دے کبھی نہیں! لیکن پھر مصلحت سے کام کیا۔

"پتا نہیں۔ کہہ رہا تھا ابھی تو جا رہا ہوں۔ دیکھو، کب آتا ہوں۔"

"عجیب چھورا ہے۔ کسی کی سنتا ہی نہیں۔" مامی بڑبڑاتے ہوئے چلی گئیں تو وہ پھر وہیں بیٹھ گئی۔

☆☆☆

کوئی مہینے بھر بعد سے ہی علی مراد کے خط آنے شروع ہو گئے تھے۔ وہ اپنی اماں کے نام خط لکھتا تھا اور پڑھ کر تو وہی سناتی تھی۔ کہیں بھولے سے بھی اس کا ذکر نہیں ہوتا تھا۔ اور جب مامی اس سے جواب لکھواتیں تو وہ بھی اپنی طرف سے کوئی بات نہیں لکھتی تھی۔ یوں

دونوں کے درمیان صرف اتنا رابطہ یا تعلق تھا کہ ایک دوسرے کے ہاتھ کی لکھی ہوئی تحریریں پڑھتے تھے اور بس۔

پھر کتنا بہت سارا وقت گزر گیا۔ علی مراد نے میٹرک کر لیا تو پتا نہیں کیا سوچ کر اُسے چند کتابیں بھیج دیں اور وہ جو یہاں آنے کے بعد سے بالکل ہی کتابوں سے ناتا توڑ بیٹھی تھی۔ پھر سے پڑھنے کی طرف مائل ہوگئی۔ رفتہ رفتہ اس کا شوق اتنا بڑھا کہ وہ گھر سے قدرے فاصلے پر ایک ٹیچر رہتی تھیں۔ ان کے پاس جا کر اُن سے انگریزی اور حساب پڑھنے لگی۔ یوں سال بھر بعد ہی وہ امتحان دینے کے قابل ہوگئی۔ پھر یہ سلسلہ چل نکلا۔ اُسے پڑھنے کا شوق تو شروع ہی سے تھا پھر ذہین بھی تھی اس لیے زیادہ دقت نہیں ہوئی۔

اور جن دنوں وہ انٹر کے امتحانوں سے فارغ ہوئی۔ انہی دنوں علی مراد بی اے کر کے لوٹا تھا۔ اتفاق سے وہ اس وقت گھر میں اکیلی تھی۔ ماما، مامی کسی عزیز کے ہاں گئے ہوئے تھے۔ علی مراد کو دیکھ کر وہ بس لمحہ بھر کو ٹھٹکی تھی پھر اعتماد سے چلتے ہوئے اندر جانے لگی تو وہ کہنے لگا۔

"تم ابھی تک یہیں ہو؟"

"کیا مطلب؟" وہ پلٹ کر پوچھنے لگی۔ "پھر مجھے کہاں ہونا چاہیے تھا؟"

"اپنے گھر۔"

"اپنے گھر۔" وہ ہلکے سے مسکرائی۔ "میرا اپنا ذاتی گھر تو کوئی نہیں ہے۔ وہ میرے ماں باپ کا گھر ہے اور یہ ماما، مامی کا۔"

"میرا مطلب تمہارے ماں باپ کے گھر سے ہی تھا۔"

"وہاں بھی چلی جاتی ہوں۔ یہاں بھی رہ لیتی ہوں۔ کوئی خاص فرق نہیں ہے دونوں گھروں میں۔"

"تمہارا یہاں رہنا اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ تم انتظار کر رہی تھیں کہ میں بڑا ہو کر تمہارے پاس آؤں گا۔" وہ سینے پر ہاتھ باندھ کر سیدھا کھڑا ہوا تو وہ ایک نظر اس کے اونچے سراپے پر ڈال کر ہلکے سے کندھا جھٹک کر بولی۔

"نہیں علی مراد! مجھے کبھی بھی تمہارا انتظار نہیں رہا۔"

"اچھا!" اس کے انداز میں بے یقینی تھی اور ہلکا سا تمسخر بھی جسے وہ فوراً محسوس کر گئی۔

جبھی کہنے لگی۔

"کسی خوش فہمی میں مت رہنا علی مراد! تمہارے اور میرے بیچ عمروں کی خلیج ہمیشہ حائل رہے گی۔ تم کبھی بھی مجھ سے بڑے نہیں ہو سکتے۔ کبھی بھی نہیں۔"

اس کے ساتھ ہی وہ اندر چلی گئی اور وہ حیران حیران سا کتنی دیر تک وہیں کھڑا رہا۔

"یہ تم ہو زینب شاہ!" وہ طویل سانس لے کر وہیں کھاٹ پر گرنے کے انداز میں بیٹھا تو اس تبدیلی کو بہت اچھا محسوس کر رہا تھا۔ وہ خود بھی خاصا بدل گیا تھا۔ شہری ماحول اور تعلیم نے اس کی شخصیت کو نکھار دیا تھا اور اس کا لہجہ بھی پہلے والا نہیں رہا تھا۔ ویسے بھی وہ شروع سے کچھ مختلف مزاج کا تھا جب ہی تو زیادہ عرصہ گاؤں میں رہا نہیں۔ اس کی خواہش تھی کہ وہ پڑھ لکھ کر اپنے پیروں پر کھڑا ہو پھر اپنی محنت اور جدوجہد سے معاشرے میں ایک مقام بنائے۔

ابھی اس نے بی اے کیا تھا اور اس کا ارادہ ماسٹر کے بعد ڈاکٹریٹ کرنے کا بھی تھا۔ اور اس کے لیے اس کی خواہش تھی کہ وہ کہیں باہر جائے۔ بہر حال اس نے اپنی آئندہ زندگی کا جو پلان بنایا تھا۔ اس میں زینب شاہ کا کہیں گزر نہیں تھا۔ اوّل تو وہ اس سے نکاح کرنے کے حق میں ہی نہیں تھا لیکن کم عمری کے باعث اپنی بات منوا نہیں سکا تھا۔ پھر اس تمام عرصے میں اس نے زیادہ تو نہیں لیکن جب بھی اس کے بارے میں سوچا، یہی فیصلہ کیا کہ وہ اس بندھن کو توڑ دے گا۔ کیونکہ وہ سمجھ سکتا تھا کہ اس کے ساتھ ساتھ زینب پر بھی ظلم ہوا ہے۔ اُسے اب بھی یاد تھی۔ وہ نوعمری لڑکی جو اکثر چولہے میں سے راکھ کریدتے ہوئے اپنی انگلی جلا بیٹھتی تھی۔ اُس وقت وہ بہت سادہ اور معصوم ہونے کے ساتھ اندر سے کچھ ڈری ہوئی سی بھی لگتی تھی۔ جبکہ ابھی وہ بہت پر اعتماد نظر آئی تھی۔ اسے ایک گونہ اطمینان ہوا کہ کم از کم وہ پھوپھی مراداں کی طرح اپنی زندگی تباہ نہیں کرے گی۔

پھوپھی مراداں کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ ان کی شادی ایک نوسالہ لڑکے سے ہوئی تھی۔ پھر جوان ہو کر اس لڑکے نے دوسری شادی کر لی لیکن پھوپھی مراداں کو بھی نہیں چھوڑا اور المیہ یہ تھا کہ ان کے ساتھ کوئی واسطہ کوئی تعلق بھی نہیں رکھا۔ وہ بے چاری ساری عمر سوکن کے بچوں کی نوکرانی بنی رہیں۔ اُسے اپنی پھوپھی پر بے حد ترس آیا کرتا تھا۔ اور جب کم و بیش ویسے ہی حالات اس کی زندگی میں آئے تو اس نے سوچ لیا تھا کہ وہ نہ تو خود پھوپھا کی طرح

بنے گا اور نہ زینب شاہ کو پھوپھی مراداں بننے دے گا۔

کافی دیر بعد اُسے احساس ہوا کہ وہ جب سے آیا ہے۔ تنہا تنہا ہے۔ اماں، ابا کہیں نظر نہیں آ رہے تھے۔ پتا نہیں کہاں تھے۔ وہ اٹھ کر یونہی ادھر ادھر ٹہلنے لگا۔ پھر اس کے کمرے کے سامنے رک کر پہلے کچھ سوچا پھر دروازے پر دستک دے کر بولا۔

"سنو..... کیا میں اندر آ جاؤں؟"

"آ جاؤ۔" اس کی آواز سن کر وہ اندر داخل ہوا اور بیڈ سے قدرے فاصلے پر رکھے ہوئے موڑھے پر بیٹھتے ہوئے پوچھنے لگا۔

"اماں، ابا نظر نہیں آ رہے، کہاں گئے ہیں؟"

"وہ چاچا بشیر کی طرف گئے ہیں۔"

"خیریت؟"

"ان کا چھوٹا پوتا کچھ بیمار ہے۔ اسے دیکھنے گئے ہیں۔"

"کیا ہوا ہے اُسے؟"

کہیں بات ختم نہ ہو جائے۔ خاموشی نہ چھا جائے۔ اس لیے اس نے قصداً بات جاری رکھی۔

"مجھے ٹھیک طرح سے معلوم نہیں ہے۔ کافی دنوں سے اس کی بیماری کا سن رہی ہوں اور میرا خیال ہے بہتر علاج نہ ہونے کی وجہ سے وہ ٹھیک نہیں ہو رہا۔" وہ اپنا خیال ظاہر کرتے ہوئے بولی۔ "چاچا بشیر کو چاہیے، اُسے شہر لے جائیں۔ جب سے پیدا ہوا ہے، مستقل اُسے کوئی نہ کوئی بیماری لگی ہی رہتی ہے۔"

"ہوں۔" اس نے ہوں کہہ کر پہلے اس کی پشت پر لٹکتے کیلنڈر کو دیکھا پھر اسے دیکھنے لگا۔ وہ سوئی دھاگے سے کوئی کپڑا سینے میں مصروف تھی۔

"تمہاری اماں اور بابا سائیں ٹھیک ہیں؟" خاموشی کا وقفہ طویل ہونے لگا تو وہ بول پڑا۔

"ہاں، سب ٹھیک ہیں۔" اس نے دھاگے کو دانتوں مدد سے توڑا پھر کپڑا لپیٹ کر ایک طرف رکھتے ہوئے بولی۔

"تم چائے پیو گے یا۔"

"تھینکس گاڈ!" اس نے طویل سانس لیا۔ "تمہیں خیال تو آیا۔"

"مجھے بہت دیر سے خیال تھا لیکن میں ضروری کام کر رہی تھی۔" پھر اُٹھتے ہوئے بولی۔ "ابھی سکینہ کو کسی شادی میں یہی کپڑے پہن کر جانا ہے۔ تھوڑی سلائی باقی تھی، وہی مکمل کر رہی تھی۔"

"تم اس کا کام کیوں کرتی ہو؟"

"تو کیا ہوا۔ بے چاری کا چھوٹے بچوں کا ساتھ ہے۔ بہر حال تم بتاؤ۔ صرف چائے یا۔"

"چائے بھی پیوں گا لیکن اگر پہلے کچھ کھانے کو مل جائے تو۔"

"اچھی بات ہے۔" وہ کمرے سے نکلی تو وہ بھی اٹھ کر اس کے پیچھے چلا آیا لیکن پھر وہیں برآمدے ہی میں بیٹھ گیا۔ کچھ دیر بعد ہی وہ دوپہر کا رکھا ہوا کھانا گرم کر کے لے آئی۔ تخت پر اس کے سامنے دستر خوان بچھا کر کھانا رکھا اور پلٹنے لگی تو وہ پوچھنے لگا۔

"اماں کب تک آئیں گی؟"

"میں کیا کہہ سکتی ہوں۔ انہوں نے واپسی کے بارے میں کچھ نہیں کہا تھا۔ ہو سکتا ہے ابھی آجائیں یا پھر رات کو۔" پھر اسے کھانے کی طرف متوجہ ہوتے دیکھ کر چائے بنانے کی غرض سے باورچی خانے میں چلی گئی۔

وہ خود بھی شام میں چائے ضرور پیتی تھی۔ اس لیے دو کپ بنا لیے۔ پھر جھانک کر دیکھا۔ وہ کھانا کھا چکا تھا۔ تب وہ چائے لے کر آ گئی۔

"تمہیں میری وجہ سے خاصی تکلیف ہوئی۔" وہ مروتاً بولا۔

"نہیں۔ اس وقت میں ویسے بھی چائے بناتی ہی ہوں۔" اس نے عام سے لہجے میں کہہ کر دونوں کپ وہیں رکھے پھر پہلے کھانے کے برتن اٹھا کر باورچی خانے میں رکھ کر آئی اس کے بعد اپنا کپ اٹھا کر تخت کے دوسرے سرے پر بیٹھی تو کہنے لگی۔

"اب سناؤ۔ شہر میں کیا کرتے رہے ہو۔"

وہ چونک کر اسے دیکھنے لگا۔ اس کے لہجے اور انداز میں واضح طور پر بڑا پن محسوس ہو رہا تھا۔ جیسے وہ باز پرس کر رہی ہو اور اگر جو گزرے ماہ و سال کے بارے میں بتائے ہوئے اس نے اپنی کسی غلطی کا ذکر کیا تو وہ ڈانٹنے لگے گی۔ بالکل اسی طرح جس طرح بچپن میں اس کا کان مروڑ کر ڈانٹتی تھی۔ اس کا ہاتھ بے اختیار اپنے کان کی طرف چلا گیا اور نظریں چراتے

ہوئے بولا۔

"وقتاً فوقتاً خطوں میں اپنے بارے میں لکھتا تو رہا ہوں۔"

"ہاں!" وہ سر ہلا کر بولی۔ اور اب غالباً تم بی اے کا امتحان دے کر آئے ہو۔"

"ہاں۔"

"آگے کیا ارادہ ہے؟"

"ماسٹر کروں گا پھر ڈاکٹریٹ۔"

"کس سبجیکٹ میں؟" وہ پھر چونک کر دیکھنے لگا۔ یقیناً اسے توقع نہیں تھی کہ وہ اس نہج پر بھی گفتگو کر سکتی ہے۔ کچھ دیر تک اسی طرح بے یقینی سے دیکھتا رہا پھر کہنے لگا۔

"تم اس عرصے میں کیا کرتی رہی ہو؟"

"میں نے انٹر کیا ہے اور اب بی اے کی تیاری کر رہی ہوں۔"

"واقعی!" وہ خوشگوار حیرت میں گھر گیا۔ "یہ تو بہت اچھی بات ہے۔ لیکن تم نے کبھی خط میں ذکر نہیں کیا۔"

"میں نے تمہیں کبھی اپنی طرف سے خط نہیں لکھا۔ جو کچھ اماں لکھواتی تھیں، میں لکھ دیتی تھی۔" اُس نے پتا نہیں کیا جتایا اور خالی کپ اٹھا کر چلی گئیں۔

"کمال ہے۔" وہ جب کچھ قیاس نہیں کر سکا تو کندھے اچکا کر کھڑا ہو گیا پھر باہر کی طرف جاتے ہوئے اونچی آواز میں بولا۔

"سنو۔ میں ذرا یاروں دوستوں سے ملنے جا رہا ہوں۔"

اس نے بہت خاموشی سے اسے باہر نکلتے ہوئے دیکھا پھر رات کے کھانے کی تیاری میں لگ گئی۔ بظاہر مصروف لیکن ذہن الجھتا جا رہا تھا۔ یہ تو نہیں تھا کہ اس تمام عرصے وہ اپنے آپ سے غافل رہی تھی بارہا اُس نے سوچا تھا اور علی مراد کی طرح اس نے بھی اپنی آئندہ زندگی کے لیے باقاعدہ پلان بنایا تھا کہ وہ کم از کم گریجویشن کر کے سب سے پہلے اپنے پیروں پر کھڑی ہو گی اس کے بعد اپنے حق کے لیے آواز اٹھاتے ہوئے والدین کے اس فیصلے کو سراسر غلط قرار دیتے ہوئے علی مراد سے علیحدگی اختیار کرے گی۔ اس کا دل کسی طرح بھی اس کے ساتھ پر آمادہ نہیں تھا۔ وہ اگر آج اس سے قد میں اونچا ہو کر آیا تھا تو اس کا یہ مطلب کہ درمیانی سات سالوں کا فاصلہ بھی مٹا آیا ہے۔ یہ فاصلہ تو کبھی مٹ ہی نہیں سکتا

تھا۔اب وہ پچیس سال کی عمر میں کافی میچور ہوگئی تھی۔ جبکہ اس کے مقابلے میں اٹھارہ سال کا نوجوان اپنے آپ کو لاکھ میچور پوز کرے اس کی ذہنی سطح تک نہیں پہنچ سکتا تھا۔ بہر حال وہ اس کی اچانک آمد سے قدرے پریشان ضرور ہوگی تھی۔ اور اب سوچ رہی تھی کہ کسی بھی بہانے اماں کے گھر چلی جائے گی اور جب تک علی مراد یہاں ہے وہیں رہے گی۔ انہی سوچوں میں الجھی ہوئی تھی کہ سکینہ آگئی۔ وہ اسے دیکھ کر ہاتھوں میں پکڑا چاولوں کا تسلا رکھ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

''میں نے تمہارا سوٹ تیار کر دیا ہے۔ بیٹھو لے کر آتی ہوں۔'' وہ اندر جانے لگی تو سکینہ راستہ روک کر پوچھنے لگی۔

''سنا ہے علی مراد آیا ہے؟''

''ہاں!'' اس نے بے حد سرسری انداز میں ہاں کیا۔

''کہاں ہے؟'' سکینہ ادھر ادھر دیکھتے ہوئے پوچھنے لگی۔

''اپنے یاروں دوستوں سے ملنے گیا ہے۔''

''تجھ سے مل لیا؟'' وہ سکینہ کی شرارت سمجھ کر انجان بن گئی اور اس کے قریب سے نکل کر اندر آگئی تو سکینہ پیچھے چلی آئی۔

''کیا کیا باتیں ہوئیں علی مراد سے؟''

''تو نہیں سمجھے گی۔'' وہ اس کا سوٹ اٹھا کر اس کے ہاتھوں پر رکھتے ہوئے بولی۔

''ارے واہ! میں کیوں نہیں سمجھوں گی۔ سچ سچ بتا۔''

''سچ سچ بتاؤں۔'' وہ ہنسی۔ اسی وقت باہر ماما مامی کی آوازیں سن کر اس نے دل ہی دل میں شکر کیا اور سکینہ کو تقریباً گھسیٹتے ہوئے باہر لے آئی تو اس سے پہلے ہی سکینہ کہنے لگی۔

''چاچی! تیرا بیٹا علی مراد آیا ہے۔''

''کہاں ہے؟'' ماما، مامی دونوں کی خوشی سے بھرپور آواز کے ساتھ میں بے قرار نظریں ادھر ادھر بھٹکنے لگیں۔

''ابھی باہر نکلا ہے۔''

''جا مراد کے ابا! جلدی سے اسے بلا لا۔'' مامی نے کہا تو ماما اسی وقت باہر نکل گئے۔ اس نے کھڑے کھڑے چاچا بشیر کے پوتے کی خیریت پوچھی پھر سکینہ کے جانے کے بعد

دوبارہ کچن میں آگئی۔

علی مراد، ماما کے ساتھ آگیا۔ پھر ظاہر ہے چھ سال بعد آیا تھا۔ رات دیر تک ان کے پاس بیٹھا رہا۔ اس دوران اس نے کھانا پکایا پھر سب کے سامنے دسترخوان پر سجایا لیکن خود ان کے ساتھ کھانے میں شریک نہیں ہوئی۔ اس کے بعد کچن کے آخری سب کام نمٹا کر اپنے کمرے میں آئی۔ اس وقت تک وہ اپنے اماں، ابا کے پاس ہی بیٹھا تھا۔ اس نے حسب معمول اور حسب عادت بیڈ پر بیٹھتے ہی ایک کتاب اٹھا لی لیکن پھر بہت جلد اکتا کر واپس رکھی اور سونے کے لیے لیٹی تو برآمدے میں سے علی مراد کی آواز آئی۔ وہ غالباً عجلت میں چلتا ہوا کہہ رہا تھا۔

''میں جا رہا ہوں اماں! دوست انتظار کر رہے ہوں گے۔'' پھر اس کی آواز دور سے آئی۔

''دروازہ بند کر لیں۔ ہوسکتا ہے۔ میں صبح آؤں۔''

اس نے طویل سانس لے کر کروٹ بدلی اور آنکھیں بند کر لیں۔

رات کا جانے کون سا پہر تھا جب ہلکے شور سے اس کی آنکھ کھل گئی۔ فوری طور پر اس کی سمجھ میں نہیں آیا پھر جب غور کیا تو بیرونی دروازے پر دستک ہو رہی تھی۔ وہ اٹھ کر کمرے سے نکل آئی۔ پہلے سوچا۔ ماما کو اٹھا دے لیکن پھر خود ہی دروازے کے پاس آکر پوچھنے لگی۔

''کون ہے؟''

''میں ہوں علی مراد!'' اس نے بڑھ کر دروازہ کھول دیا اور وہ شاید دروازے کے سہارے کھڑا تھا جس کے کھلنے سے اس کا توازن بگڑ گیا۔ چند قدم لڑکھڑایا تو اس نے تھام لیا۔

''کیا ہوا ہے تمہیں۔'' وہ بمشکل اس کے وجود کو سہارا دے کر تشویش سے پوچھنے لگی۔ اور جب وہ بولا تو جہاں زبان لڑکھڑائی وہاں سانسوں کے ساتھ ناگواری مہک سیدھی اس کے نتھنوں میں جا گھسی۔

''علی مراد!'' اُس نے بے حد ناگواری سے اُسے دیکھا۔ اُس کی سرخ آنکھیں بند ہوئی جا رہی تھیں۔ دل چاہا زوردار دھکا دے کر اسے دور گرا دے کہ پل میں اس کا سارا نشہ ہرن ہو جائے لیکن وہ چاہنے کے باوجود ایسا نہ کر سکی۔ بڑی مشکل سے اسے کمرے تک

لائی۔ بیڈ پر لٹایا تب سرزنش کرنے سے باز نہ رہ سکی۔

"کس قدر بے ہودہ حرکت کی ہے تم نے۔ اگر ماما، مامی کو پتا چل جائے تو انہیں کتنا دکھ ہوگا۔ آخر گئے کیوں تھے آوارہ لڑکوں کے پاس؟"

ساتھ ساتھ اس کے جوتے بھی اتار رہی تھی پھر موزے اتارے۔ اس کے بعد چادر اوڑھا رہی تھی کہ اس نے اس کے ہاتھوں کو اپنی گرفت میں لے لیا۔

"زینو! تم میری ہوں ناں زینو!" وہ یقیناً ہوش میں نہیں تھا۔ پتا نہیں کیا کچھ کہے جا رہا تھا۔ وہ اپنے ہاتھ چھڑانے کی کوشش کرنے لگی اور پھر اپنی کوشش میں ناکام ہو کر بے بسی سے ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ کسے آواز دے۔ کسے پکارے اور کوئی آ بھی گیا تو کیا کہے گی کہ علی مراد بہر حال اس کا شوہر تھا۔ کلائی تھامے یا اس سے آگے کی بات کرے۔ کون روک سکتا تھا اُسے۔

☆☆☆

صبح کے اجالے میں دونوں کے رنگ مختلف تھے۔ وہ بے حد غصے میں تھی لیکن اظہار کا کوئی طریقہ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ اور براہِ راست اس سے بات کرنا تو دور کی بات اس کی طرف دیکھ بھی نہ سکی۔ جبکہ وہ پہلے نادم پھر وہی بگڑا ہوا بچہ جو اپنی مرضی کے خلاف بات ہو جانے پر چیخ چیخ کر سارا گھر سر پر اٹھا لیتا ہے۔ وہ کمرے میں بیٹھی اس کی آوازیں سنتی رہی۔ وقفے وقفے سے کسی نہ کسی بہانے چلا رہا تھا۔ دوپہر میں اسے کھانا پسند نہیں آیا تو سب کچھ الٹ کر رکھ دیا۔ اور شام میں مامی سے کسی بات پر تکرار کرتے کرتے یوں اکھڑا کہ اسی وقت اپنا سامان باندھ لیا۔

"میں جا رہا ہوں اور اب دوبارہ کبھی اس گھر میں نہیں آؤں گا۔"

"کیا کہہ رہا ہے علی مراد! میں نے ایسی کیا بات کی ہے جو تو اتنا غصہ کر رہا ہے۔" مامی ایک دم دھیمی پڑ گئیں۔

"بس اماں! میں یہاں نہیں رہ سکتا۔"

"پر کیوں؟"

"مجھے نہیں پتا۔"

"دیکھ علی مراد! ایسی باتیں نہ کر۔" مامی نے اسے کھینچ کر اپنے پاس بیٹھا لیا پھر دُلار سے کہنے لگیں۔

"اتنے سالوں کے بعد ابھی کل ہی تو آیا ہے اور ابھی جانے کی بات کر رہا ہے۔ میں نے تو ابھی دل بھر کر دیکھا بھی نہیں؟"

"مجھے دیکھنے کی کیا ضرورت ہے۔" وہ ہاتھ چھڑا کر کھڑا ہو گیا۔ "وہ جو گھر میں ایک چھوکری لا ڈالی ہے آپ لوگوں نے۔ صبح شام اسے دیکھا کریں۔"

"کون؟ زینب۔" مامی اچنبھے سے بولیں۔

"ہاں وہی۔"

"تو ایسے کیوں بول رہا ہے۔ وہ تیری بیوی ہے۔"

"بیوی!" وہ عجیب سے انداز میں ہنسا پھر اپنا بیگ کندھے پر لٹکا کر ایک طرح سے جانے کے لیے تیار ہو گیا۔

"علی مراد! ہوش کر، اپنے ابا کو تو آنے دے۔" مامی اسے جانے پر آمادہ دیکھ کر پریشان ہو گئیں۔

"ابا سے میں راستے میں مل لوں گا۔"

"پر تو اتنی جلدی کیوں جا رہا ہے۔ کچھ پتا تو چلے؟" مامی اس کے پیچھے پیچھے چلتی آئیں لیکن وہ پتا نہیں کیا سوچ چکا تھا کہ اُن کی بات کا جواب ہی نہیں دیا۔ خدا حافظ کہہ کر باہر نکل گیا۔ تب مامی بھاگتے ہوئے اس کے پاس آئیں۔

"زینب! تجھے کچھ پتا ہے۔ وہ کیوں چلا گیا ہے؟"

اس نے آہستہ سے نفی میں سر ہلایا پھر کچھ سوچ کر بولی۔

"رات تو اچھا بھلا تھا۔ صبح پتا نہیں کس بات پر موڈ بگڑ گیا۔"

"عجیب چھورا ہے۔ اتنے سالوں بعد آیا تھا۔" اماں تاسف بھرے لہجے میں پتا نہیں کیا کچھ کہتے ہوئے اس کے پاس سے اٹھ کر چلی گئیں تو اس نے عجیب سے احساس میں گھر کر پیشانی گھٹنوں پر ٹکا لی۔

پھر کتنے بہت سارے دن گزر گئے۔ وہ جو شعور و آگہی کی منزلیں طے کرتے ہوئے یہ سوچتی تھی کہ وقت آنے پر اپنی زندگی کے بارے میں خود فیصلہ کرے گی تو اب اسے لگتا،

جیسے اس سے یہ اختیار چھین لیا گیا ہو اور سب سے بڑا غاصب اسے علی مراد ہی لگتا۔ وہ جب اس کے بارے میں سوچتی، اس کے اندر جوار بھاٹا اٹھنے لگتا۔ جب علی مراد کو واپس جانا ہی تھا تو اس کی نسوانیت کا دامن تار تار کیوں کیا۔ وہ جتنا سوچتی، الجھی چلی جاتی۔

☆☆☆

انہی دنوں اُسے اپنے اندر نئی تبدیلی کا احساس ہوا تو جیسے ہر شے سے جی اُچاٹ ہو گیا۔ یہ سب کچھ تو اس کے گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ علی مراد کے بچے کی ماں بنے گی۔ وہ علی مراد جس کا اس کے خواب وخیال میں کہیں گزر نہیں تھا لیکن وہی بات کہ ہونی کو کوئی نہیں ٹال سکتا۔ وہ بھی تقدیر کے اس مذاق پر حیران ضرور تھی لیکن کچھ کر نہیں سکتی تھی۔ شروع شروع میں اس نے مامی سے چھپائے رکھا لیکن یہ چھپنے والی بات نہیں تھی۔ خود ہی ظاہر ہو گی۔ اس سستی، ہر بات سے بیزاری اور وقت بے وقت سونا۔ مامی کو پہلے تشویش ہوئی پھر جب سمجھ میں آیا تو پھولے نہ سمائیں۔

''اب دیکھتی ہوں۔ علی مراد کیسے شہر میں ٹکتا ہے۔ بچے کا سنتے ہی بھاگا آئے گا۔''

مامی اٹھتے بیٹھتے اسی قسم کی باتیں کیا کرتیں اور وہ بس خاموش رہتی۔ اسے ویسے بھی ایک چپ سی لگ گئی تھی۔

علی مراد کو گئے ہوئے چار مہینے ہو گئے تھے۔ اس دوران اس نے کوئی خط نہیں لکھا تھا۔ اور اس روز اس کا خط آیا۔ وہ بھی اس کے نام۔

زینب شاہ! مجھے تمہارے قول وفعل کے تضاد نے بہت دکھ دیا ہے۔ تم ہی نے کہا تھا ناں کہ تمہیں کبھی میرا انتظار نہیں رہا اور میں تمہاری اس بات سے مطمئن ہو گیا تھا کہ چلو تمہارے بارے میں کوئی فیصلہ کرتے ہوئے مجھے کسی ملال یا پشیمانی کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا کیونکہ تم بھی ایسا ہی چاہتی ہو لیکن تم اپنی بات پر قائم نہیں رہ سکیں۔ مجھے کہنے دو زینب شاہ! کہ اس رات میں تو نشے میں تھا لیکن تم تو ہوش میں تھیں۔ مجھے روک سکتی تھی پھر تم نے مجھے کیوں نہیں روکا؟ کیا تمہارا ہتھیار ڈال دینا، اس بات کا غماز نہیں ہے کہ تم.....

''علی مراد!'' اس نے بڑی دقتوں سے اپنی چیخوں کا گلا گھونٹا تو آنسو ایک تواتر سے

بہہ نکلے۔ اس جیسے کچے مرد سے یہی توقع کی جا سکتی تھی کہ سارا الزام اس کے سر رکھ کر خود صاف بچ نکلا تھا لیکن جس بے دردی سے اس کے پندار کو ٹھیس پہنچائی تھی، اس سے وہ مہینوں نہیں سنبھل سکی۔ ایک طرح سے خود اپنی نظروں سے گر گئی تھی۔

ادھر ماما، مامی۔ ادھر اماں اور بابا سائیں اس کی گرتی ہوئی صحت سے کافی پریشان تھے۔ اپنے طور پر ہر طرح سے اس کا خیال رکھتے۔ لیکن جب وہ خود ہی اپنے آپ سے غافل تھی تو نہ کوئی دوا اثر کرتی نہ خوراک۔ اسی حالت میں اس نے ایک بیٹی کو جنم دیا۔ اور اسے دیکھ کر لمحہ بھر کو اسے یوں لگا۔۔ جیسے اس کی ساری سوچیں منجمد ہو گئی ہوں۔ سارے آدرش مسمار۔ اور پیروں میں ایسی بیڑیاں جنہیں وہ کبھی نہ توڑ سکے گی۔

''لیکن نہیں۔'' اس نے عزم سے سوچا۔ ''میں یہ ساری بیڑیاں خود اپنے ہاتھوں سے توڑوں گی اور بتا دوں گی علی مراد کو کہ عورت کبھی کبھی ہی مجبور اور بے بس ہوتی ہے ہمیشہ نہیں۔''

پھر جب وہ خود غفلت سے نکل آئی تو دنوں میں اچھی بھی ہو گئی۔ بچی کو بھی بھرپور توجہ دینے لگی۔ ساتھ ساتھ کتابوں سے بھی دوبارہ ناتا جوڑ لیا تھا اور جب وہ مگن ہو رہی تھی تب پھر علی مراد کا خط آ گیا اُسی کے نام۔

''بیٹی مبارک ہو زینب شاہ! لیکن یہ مت سمجھنا کہ اس کے توسط سے تم میرے دل میں کوئی مقام حاصل کر سکو گی۔ ہرگز نہیں مجھے تم سے اور تمہاری بیٹی سے کوئی لگاؤ نہیں اور جب یہ طے ہے کہ مجھے تمہارا ساتھ کسی صورت منظور نہیں تو میں تمہیں پابند نہیں رکھنا چاہتا۔ اگر تم چاہو تو میں تمہیں طلاق دے سکتا ہوں۔

''اگر میں چاہوں.....'' اس کے اندر ڈھیر ساری تلخی بھر گئی۔ ''یہاں بھی اپنا دامن بچا لینا چاہتے ہو علی مراد۔''

اور اب کی بار وہ خاموش نہیں بیٹھی بلکہ اس وقت کاغذ قلم اٹھا کر اسے جواب لکھ ڈالا۔

علی مراد! تم یقیناً میرے بارے میں غلط فہمی کا شکار ہو۔ پہلے میں تمہاری غلط فہمی دور کر دوں تو سنو۔ مجھے یا میری بیٹی کو تمہارے دل میں مقام بنانے کی نہ ضرورت ہے نہ خواہش۔ اور میں نے اب نہیں بلکہ بہت پہلے یہ طے کر لیا تھا کہ مجھے تمہارے ساتھ نہیں رہنا۔ تم بھلا مجھے دے ہی کیا سکتے ہو۔ زیادہ سے زیادہ اتنا کر سکتے ہو

کہ زمین پر جھولتا میرا آنچل تھام لو لیکن اس آنچل سے میرے سر پر سائبان تانا تمہارے بس سے باہر ہے اس کے لیے تمہیں درمیانی سات سالوں کا فرق مٹانا ہوگا جو کہ تم ہرگز ہرگز نہیں مٹا سکتے۔ اور گو کہ میں نے ابھی اپنی آئندہ زندگی کے بارے میں نہیں سوچا پھر بھی تم اگر چاہو تو مجھے طلاق دے سکتے ہو۔"

وہ بڑی خوبصورتی سے اس کی بات لوٹا کر اطمینان سے ہوگی۔ پھر اگلے کئی دن تک اس کی طرف سے جواب کا انتظار بھی کرتی رہی لیکن وہ شاید آئینے میں اپنی صورت دیکھ کر خاموشی اختیار کر گیا تھا۔

☆☆☆

اُس نے بی اے کر لیا تو وہیں ایک مقام اسکول میں اسے جاب مل گئی۔ اس وقت اس کی بیٹی ثانیہ دو سال کی ہو چکی تھی۔ اور وہ محض اپنی بیٹی کی وجہ سے ابھی اس چھوٹے سے شہر یا گاؤں میں رکی ہوئی تھی۔ اور اس نے سوچ لیا تھا جیسے ہی ثانیہ اسکول جانے کے قابل ہوگی وہ اسے لے کر کسی بڑے شہر کا رخ کرے گی جہاں اس کی بیٹی بھی اچھی تعلیم حاصل کر سکے اور وہ خود بھی زندگی کے کسی شعبے میں کوئی مقام بنانے کی کوشش کر سکتی تھی۔ انہی دنوں علی مراد کا خط اماں کے نام آیا۔ اس نے لکھا تھا۔ وہ ڈاکٹریٹ کے لیے باہر جا رہا ہے۔ اسے اس خبر سے کوئی خاص فرق نہیں پڑا۔ جبکہ اماں اچانک اس سے متنفر ہو گئیں۔ بالکل روایتی ساس بن کر سارا الزام اس کے سر رکھ دیا۔

"میرا بیٹا ایسا نہیں تھا۔ جب سے تو اسے گھر میں آئی ہے۔ اسے پتا نہیں کیا ہو گیا ہے۔ کیا کر دیا ہے تو نے کہ وہ گھر سے دور ہی دور ہوتا جا رہا ہے۔"

پھر ان کی عادت ہو گئی۔ ہر وقت طعنے، کوسنے۔ ننھی ثانیہ کو بھی بات بے بات جھڑکنے لگی تھی اور اپنی حد تک تو اس نے سب برداشت کیا لیکن جب بیٹی کی بات آئی تو وہ خاموش نہیں رہ سکی۔ برابر سے جواب دینے لگی۔ یوں ایک دن جھگڑا اتنا بڑھا کہ وہ گھر چھوڑنے پر مجبور ہو گئی۔ اماں اور بابا سائیں کے پاس آئی تو پہلے تو کچھ دن انہوں نے اس کی دلجوئی کی پھر اُلٹا اسے سمجھانے میں لگ گئے۔

"کس لیے میں وہاں جاؤں؟ اور کس کے لیے؟ ایک دن وہ پھٹ پڑی۔" کیا میری

شادی ماما، مامی کے ساتھ ہوئی تھی۔ جو میں ساری زندگی ان کی نوکری کرتی رہوں۔"

"نوکری کیوں، وہ تیرے ساس سسر ہیں۔ ان کی خدمت کرے گی تو علی مراد بھی تجھ سے خوش ہوگا۔"

"کیا؟" وہ چیخ پڑی۔ "مت نام لیا کریں میرے سامنے علی مراد کا۔ میرا اُس سے کوئی واسطہ نہیں اور مجھے کوئی ضرورت نہیں اُسے خوش کرنے کی۔" قدرے توقف کے بعد بولی۔

"اب میں سمجھی، دو سالوں گھر سے غافل اتنے اطمینان سے کیسے رہتا ہے۔ اسے پتا ہے ناں کہ اس کے ماں باپ کی دیکھ بھال اور خدمت کو میں جو موجود ہوں۔"

پھر اپنے آپ پر حیرت کرنے لگی۔ "کمال ہے، میں اب تک سمجھ ہی نہیں سکی۔ مجھے تو بہت پہلے وہ گھر چھوڑ دینا چاہیے تھے۔"

"کیسی باتیں کر رہی ہے۔ پتا بھی ہے، برادری والے کیسی کیسی باتیں کر رہے ہیں۔"

"برادری والوں کو اور کام ہی کیا ہے۔ میں یہاں آئی ہوں تو باتیں کرنے لگے ہیں۔ اس سے پہلے کیوں خاموش تھے؟ علی مراد پر انگلیاں کیوں نہیں اٹھائیں۔ اس لیے کہ وہ مرد ہے اور مردوں کی ہر بات جائز سمجھ لی جاتی ہے۔ بس کریں اماں اگر سب یہ چاہتے ہیں کہ میں بھی پھوپھی مراداں کی طرح پہلے اس کے انتظار میں یہ عمر گنوا دوں، اس کے بعد سوکن کے بچوں کی آیا گیری پر..... ہو جاؤں تو یہ ناممکن ہے۔" وہ حتمی انداز میں بولی۔

"چار جماعتیں پڑھ کر تیرا دماغ خراب ہو گیا ہے۔"

"دماغ خراب نہیں ہوا۔ سمجھ آئی ہے مجھے۔"

"یہی سمجھ آئی ہے کہ خاوند کا گھر چھوڑ کر۔"

"وہ خاوند نہیں لٹیرا ہے۔" وہ فوراً ٹوک گئی۔

"اے چھوری! بس کر، برادری میں کسی اور نے تیری باتیں سن لیں تو تیرے ساتھ ساتھ ہمارا بھی جینا مشکل کر دیں گے۔"

اماں نے اس کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے تو وہ بمشکل اپنے آپ پر قابو پا کر ان کے پاس بیٹھی پھر ان کے ہاتھ تھام کر کہنے لگی۔

"اماں! آپ لوگوں کی باتوں کی پروا مت کریں۔ کوئی ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ ویسے بھی میں بہت جلد کراچی جا رہی ہوں۔"

"علی مراد کے پاس؟"

"نہیں۔" اماں کے بے تابی سے پوچھنے پر اسے نے پھیکی مسکراہٹ کے ساتھ نفی میں سر ہلایا پھر کہنے لگی۔

"علی مراد کراچی میں نہیں امریکہ میں ہے۔"

"پھر تو کس کے پاس جا رہی ہے؟"

"کسی کے پاس نہیں۔ یہاں اسکول میں ایک استانی کراچی سے آئی ہوئی تھی۔ پچھلے مہینے اس نے اپنا تبادلہ دوبارہ کراچی کرا لیا تھا۔ اور میں نے اس سے کہا تھا وہ وہاں میرے لیے رہائش اور نوکری کا انتظام کرے پھر میں بھی وہیں آجاؤں گی۔" اس نے بتایا تو اماں کتنی دیر تک ٹھوڑی پر انگلی ٹکائے اسے یوں دیکھے گئیں جیسے اس کی دماغی حالت پر شبہ ہو۔

"مجھے یہاں نہیں رہنا اماں!" وہ رسان سے سمجھاتے ہوئے بولی۔ "اور یہ فیصلہ میں نے صرف اپنے لیے نہیں بلکہ اپنی بیٹی کی بہتری کے لیے کیا ہے۔ میں اسے دوسری زینب نہیں بننے دینا چاہتی۔ میرا کیا ہے۔ جتنی زندگی گزر گئی۔ اتنی اور بھی گزر جاتی پھر بھی مجھے پھوپھی مراداں کسی صورت نہیں بننا تھا۔ بہر حال ثانیہ کو میں برادری کے رواجوں کی بھینٹ نہیں چڑھنے دوں گی۔ اس لیے میں اسے یہاں سے لے کر جا رہی ہوں۔"

"پر چھوری!" اماں نے کچھ کہنا چاہا کہ اُس نے ان کے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ دیا۔

"مجھے مت روکیں بلکہ میں تو یہ کہوں گی کہ آپ اور بابا سائیں بھی میرے ساتھ چلیں۔"

"کہاں چلیں؟" بابا سائیں نے آتے ہی اس کی آخری بات سنی تھی۔ اس نے ایسی نظروں سے اماں کو دیکھا جیسے کہہ رہی ہو۔ اب بابا سائیں کو سمجھانا آپ کا کام ہے پھر اٹھ کر اندر چلی گئی۔

یونہی کتنے بہت سارے دن گزر گئے۔ اس کے ارادوں کی رفتہ رفتہ سب کو خبر ہو گئی اور بظاہر سب ہی نے اعتراض کیا لیکن اُسے اب کسی کی پروا نہیں تھی۔ وہ تو بس انتظار میں تھی کہ کب ذکیہ اس کے لیے رہائش اور جاب کا انتظام کر کے اسے بلاتی ہے۔ اس کے ایک دو

خط آ چکے تھے۔ جس میں اس نے لکھا تھا کہ وہ اس کے لیے کوشش کر رہی ہے۔ بہر حال وہ جلد از جلد یہاں سے نکلنا چاہتی تھی کیونکہ یہاں اب سب اس کے بارے میں عجیب و غریب باتیں کرنے لگے تھے۔ روزانہ کوئی نہ کوئی آجاتا۔ پہلے سنی سنائی باتوں کی اماں سے تصدیق کی جاتی، خاص طور پر اس کے جانے کی۔ اس کے بعد اس کے منہ پر تو اس کے سب سے بڑے ہمدرد بن کر اسے سمجھانے کی کوشش کرتے لیکن اس گھر سے نکلتے ہی طرح طرح کی باتیں شروع ہو جاتیں ان سب میں ایک پھوپھی مراداں ہی تھیں جنہوں نے آ کر اس سے کہا تھا۔

"تو بہت اچھا کر رہی ہے زینب! جو یہاں سے جا رہی ہے۔ ورنہ تیرا حال بھی میرے جیسا ہوتا۔" اور وہ ان کے ہاتھ تھام کر محبت سے بولی۔

"پھوپھی! آپ بھی میرے ساتھ چلیں۔ یقین کریں۔ میں آپ کو بہت آرام سے رکھوں گی۔"

"میں جانتی ہوں۔ پر دھیے! اب تو زندگی گزر گئی۔ اُن کے لہجے میں حسرت تھی، دکھ تھا۔ جس سے اس کی آنکھیں نم ہو گئی تھیں۔

☆☆☆

اُس کی زندگی کا نیا باب شروع ہو گیا۔ جس میں فوری طور اسے کسی پریشانی یا دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ کیونکہ ذکیہ نے جاب اور رہائش دونوں کا انتظام کر کے اسے بلایا تھا۔ شہر کے ایک متوسط علاقے میں ایک کمرے کا پورشن اس کے اور ثانیہ کے لیے کافی تھا۔ کمرا کافی کشادہ تھا۔ پھر چھوٹا سا کچن اور باتھ روم وغیرہ اس کے علاوہ پوری کھلی چھت۔ نچلے حصے میں مکان مالک خود رہتے تھے۔ جن کی ایک بیٹی اسی اسکول میں پڑھاتی تھی جہاں اسے جوائن کرنا تھا۔ پھر سب سے بڑی سہولت یہ کہ اسکول گھر سے قریب ہی تھا۔ وہ پیدل آ جا سکتی تھی۔

اُس کے پاس اپنی جمع پونجی بہت زیادہ نہیں تھی پھر اسے یہ خیال بھی تھا کہ پتا نہیں یہاں کس قسم کے حالات سے گزرنا پڑے اس لیے کافی سوچ سمجھ کر اس نے خرچ لیا۔ بس ایک بیڈ اور دو کرسیاں کمرے کے لیے اور مہینے بھر کا راشن لے کر باقی پیسے سنبھال

رکھے۔ فی الحال اس سے زیادہ ایسے کسی چیز کی ضرورت بھی نہیں تھی۔

پھر پہلی تاریخ سے اُس نے اسکول جوائن کیا تو ساتھ ہی ثانیہ کو بھی موسیسٹری میں داخل کر دیا۔ یوں کچھ دنوں میں ہی وہ اپنی اس زندگی میں سیٹ ہو گئی۔ اگر دیکھا جاتا تو اس کی یہ زندگی پہلے کے مقابلے میں بہت سہل تھی۔ کیونکہ سارا دن گھر کے بکھیڑوں میں نہیں الجھنا پڑتا تھا۔

صبح نماز کے بعد ہی وہ ناشتے کے ساتھ ساتھ دوپہر کے لیے کھانا پکا کر رکھ دیتی تھی۔ پھر خود تیار ہو کر ثانیہ کو تیار کرتی۔ اس کے بعد دونوں ناشتا کر کے اسکول چلی جاتیں۔ جہاں سے واپسی پر کوئی خاص کام نہیں ہوتا تھا۔ بس کھانا گرم کرنا اور کھانا اور اس کے بعد وہ ثانیہ کو سلاتے سلاتے اکثر خود بھی خود سو جاتی تھی۔ شام میں تھوڑی دیر چہل پہل ہو جاتی کیونکہ اس کے پاس کھلی چھت تھی اس لیے عابدہ اور مریم کھلی فضا کی خاطر اس کے پاس آ جاتیں۔ عابدہ اسی کے ساتھ اسکول میں پڑھاتی تھی جبکہ مریم ابھی بی اے میں پڑھ رہی تھی۔ دونوں کافی ملنسار لڑکیاں تھیں، جلد گھل مل جانے والی۔ جبھی چند دنوں میں ہی اس کی ان سے کافی دوستی ہو گئی تھی۔ اور اس نے اپنے بارے میں کوئی جھوٹ نہیں بولا تھا۔

ایک دن جب عابدہ نے اس کے شوہر کے بارے میں پوچھا تھا تو اس نے پوری سچائی سے اپنے تمام حالات کہہ سناتے تھے۔ اس وقت تو انہیں اس کے حالات پر حیرت کے ساتھ افسوس بھی ہوا تھا کہ کس طرح ایک نوعمر لڑکے کے ساتھ اس کی شادی ہوئی تھی لیکن اب اکثر دونوں اس کے ساتھ مذاق کر جاتی تھیں۔

''سنو، علی مراد کے لیے نپل ضرور لیتی آنا۔'' جب بھی وہ ڈبل روٹی وغیرہ لینے کے لیے بیکری تک جانے لگتی دونوں اسے ضرور چھیڑتیں۔

''اب وہ اتنا چھوٹا بھی نہیں ہے۔''

وہ اب ان باتوں کو انجوائے کرنے لگی تھی۔ اور دونوں جگہوں میں یہی واضح فرق تھا کہ وہاں وہ ان ساری باتوں پر کڑھتی رہتی تھی اور یہاں ساری باتیں بے معنی ہو کر رہ گئی تھیں۔ یہی تو ہے کہ اگر حالات کو اپنے اوپر طاری کر کے مسلسل روتے اور کڑھتے رہو تو زندگی انتہائی کٹھن اور دشوار لگتی ہے۔ اس کے برعکس حالات کو تابع کر لینے سے راہیں خود بخود آسان ہو جاتی ہیں اس نے بھی اپنی زندگی کے اس المیے پر کڑھنا چھوڑ دیا تھا۔ اب اس

کے سامنے ثانیہ تھی۔ اس پر بھرپور توجہ دینے کے بعد بھی اس کے پاس اتنا وقت ہوتا تھا کہ وہ آرام سے ایم اے کی تیاری کرنے لگی۔

وقت کا پہیہ اپنی مخصوص رفتار سے چل رہا تھا اور زینب شاہ جو بہت حد تک مگن ہو گئی تھی اس روز پھر ڈسٹرب ہو گئی۔ جب ثانیہ نے اچانک اس سے سوال کر ڈالا۔

''میرے پاپا کہاں ہیں؟'' وہ کتنی دیر تک بچی کو دیکھتی رہی کہ اسے یہ خیال کیونکر آیا۔ پھر خیال آیا، اسکول میں بچے اپنے پاپا کی باتیں کرتے ہوں گے۔ وہ سوچنے لگی، اسے کیا جواب دے کہ وہ مطمئن ہو جائے۔

''بتائیں ناں مما۔'' ثانیہ اس کا کندھا ہلا کر اصرار سے پوچھنے لگی۔

''تمہارے پاپا باہر ہیں۔'' وہ پیشانی تک آئے اس کے بالوں کو سنوارتے ہوئے بولی۔

''باہر کہاں؟''

''امریکہ.....اور امریکہ بہت دور ہے۔''

''بہت دور۔ میں وہاں نہیں جا سکتی۔'' بچی مایوس نظر آنے لگی۔

''جا سکتی ہو لیکن ابھی۔ جب تم بڑی ہو جاؤ گی تب۔'' اس نے بہلایا۔

''ریل گاڑی میں بیٹھ کر؟''

''نہیں، ہوائی جہاز میں۔'' وہ مسکرائی۔

''پاپا بھی ہوائی جہاز میں گئے ہیں؟''

''ہاں اور اب تم سو جاؤ۔ صبح اسکول جانا ہے۔'' وہ اس کے موضوع کو ختم کرنے کی غرض سے بولی پھر آہستہ آہستہ اسے تھپکنے لگی۔

''مما!'' وہ سوتے سوتے پھر بیدار ہو گئی جیسے اس کا ذہن ابھی تک انہی باتوں میں الجھا ہو۔ ''پاپا کیسے ہوتے ہیں؟''

''جب آئیں گے تو دیکھ لینا۔'' وہ اکتا کر بولی۔

''کب آئیں گے؟''

''پتا نہیں، چلو اب باتیں مت کرو۔ مجھے نیند آ رہی ہے۔''

وہ زور زور سے اسے تھپکنے لگی۔ کچھ دیر میں بچی سو گئی اور سونا تو وہ بھی چاہتی تھی لیکن بچی

کی باتوں میں ذہن یوں الجھا کہ نیند غائب ہوگئی۔اب تک اس انچ پر تو اس سوچا ہی نہیں تھا کہ بچی، باپ کی کمی محسوس کرے گی اور اس کے بارے میں سوالات کرنے لگے گی۔اسے علی مراد کا خیال آیا جس نے پہلے مرحلے پر ہی کہہ دیا تھا کہ اسے بچی سے کوئی لگاؤ نہیں۔وہ سوچنے لگی۔جب میری بچی کو یہ معلوم ہوگا کہ اس کے باپ کے نزدیک اس کی کوئی اہمیت نہیں تو وہ کتنی رنجیدہ ہوگی۔پھر اس نہج پر سوچتے سوچتے رات کے جانے کس پہر اس کی آنکھ لگی۔اور دیر سے سونے کا نتیجہ تھا کہ صبح معمول کے مطابق اٹھ نہیں سکی۔روزانہ تو یہ ہوتا تھا کہ وہ تیار ہو کر نیچے چلی جاتی تھی۔پھر عابدہ کے ساتھ اسکول کے لیے نکلتی اور آج جب وہ نہیں اُتری تو عابدہ اُسے بلانے آ گئی۔لیکن اُسے سوتے دیکھ کر عابدہ کو خاصی تشویش ہوئی ہلکے سے اس کا کندھا ہلا کر پوچھنے لگی۔

''زینو! تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے۔''

''ہاں!'' اس نے ذرا سی آنکھیں کھولیں اور عابدہ کو دیکھ کر ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھی۔''اتنی دیر ہوگئی۔''

''کیا آج اسکول نہیں جاؤ گی؟''

''نہیں، میری طبیعت کچھ بوجھل سی ہو رہی ہے۔تم پلیز میڈم سے کہہ دینا۔''

''وہ تو میں کہہ دوں گی لیکن تمہیں ہوا کیا ہے؟'' وہ اسے دیکھتے ہوئے بولی۔''اگر رات سے طبیعت خراب تھی تو ہم میں سے کسی کو بلا لیا ہوتا۔''

''نہیں۔رات تو میں ٹھیک تھی۔''

''اچھا! اب تم آرام کرو۔میں مریم کو بھیجتی ہوں۔وہ تمہیں چائے وغیرہ بنا دے گی۔''

''ارے نہیں، اب ایسی بیمار بھی نہیں ہوں اور کیا مریم کالج نہیں جا رہی؟'' وہ اٹھنے لگی تو عابدہ نے روک دیا۔

''چہرے سے ہی بیمار لگ رہی ہو۔آرام سے بیٹھی رہو۔'' پھر جاتے جاتے بولی۔

''مریم آج پتا نہیں کسی خوشی میں کالج نہیں جا رہی۔یہ تم اسی سے پوچھ لینا۔''

اس نے ہلکے سے مسکرا کر سر ہلایا تھا پھر تکیہ اونچا کر کے بیک سے ٹیک لگا کر ثانیہ کو دیکھنے لگی۔وہ بے خبر سوئی کس قدر معصوم لگ رہی تھی، اسے اس پر ٹوٹ کر پیار آیا۔اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے دھیرے سے بڑبڑائی۔

''آج میں نے نہیں اٹھایا تو خود ہی سے بھی نہیں اٹھی۔''

''بھئی کس کی طبیعت خراب ہے۔آپ کی یا ثانیہ کی؟'' مریم آندھی طوفان کی طرح نازل ہوئی۔''عابدہ اتنی عجلت میں کچھ کہتے ہوئے گئی ہے کہ میری سمجھ میں بھی نہیں آیا۔''

''کچھ زیادہ نہیں ہے بس ذرا۔''

''ارے آپ کی تو آنکھیں بھی سرخ ہو رہی ہیں۔لگتا ہے رات میں سوئیں نہیں۔کمال ہے۔اسی وقت مجھے بلا لیتیں۔'' پھر اسے خاموشی سے دیکھتے پا کر بولی۔

''اس طرح کیا دیکھ رہی ہیں؟''

''تم لوگ خوامخواہ پریشان ہو رہے ہو۔مجھے کچھ نہیں ہوا۔رات بالکل ٹھیک ٹھاک تھی۔بس ابھی ذرا طبیعت بوجھل لگ رہی ہے۔اور یہ کوئی ایسی بات نہیں ہے۔ابھی ٹھیک ہو جاؤں گی۔''

''ٹھیک تو آپ کو ابھی ہونا پڑے گا کیونکہ آپ اس طرح بیٹھی بالکل اچھی نہیں لگ رہیں۔خیر، پہلے میں آپ کے لیے چائے لے آؤں۔'' وہ کمرے سے نکل کر کچن میں چلی گئی تو وہ دل ہی دل میں ان کے خلوص کی معترف ہوتے ہوئے سوچنے لگی۔

''یہ بھی اللہ کا شکر ہے کہ اتنے اچھے لوگ ملے ہیں ذرا بھی اجنبیت کا احساس نہیں ہوتا۔''

''چائے لیجیے۔'' وہ اتنی جلدی چائے لے کر آ گئی۔مگ اسے تھمایا پھر ثانیہ کو اٹھانے لگی۔

''ثانی بیٹا! اُٹھ جاؤ۔اسکول کا وقت نکل چکا ہے آج چھٹی۔''

''اور تم نے کس خوشی میں چھٹی کی ہے؟'' وہ اس سے پوچھنے لگی۔

''عابدہ نے نہیں بتایا؟''

''نہیں۔'' وہ عجلت میں تھی، کہہ رہی تھی تم سے پوچھوں۔

''اچھا!'' مریم خوشدلی سے ہنسی پھر کہنے لگی۔''اصل میں آج کچھ خاص مہمان آ رہے ہیں۔''

''خاص؟'' وہ سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی۔

''عابدہ کے لیے۔''

"اچھا!" اس نے اشتیاق ظاہر کیا۔ کون لوگ ہیں؟ میرا مطلب ہے، رشتے داروں میں یا۔"

"بہت دور کی رشتے داری ہے۔ یعنی پھوپھی کے دیور کے سالے وغیرہ وغیرہ۔"

وہ اس کے انداز پر بے ساختہ ہنس پڑی تو وہ ثانیہ کو گود میں اُٹھا کر اُٹھتے ہوئے بولی۔

"بس آپ جلدی سے فریش ہو جائیں۔ ایک دم ہشاش بشاش تا کہ آپ کو مہمانوں سے متعارف کرایا جا سکے۔"

"اچھی بات ہے۔ اور یہ تم ثانیہ کو کہاں لے جا رہی ہو؟"

"اس کا منہ دھلا دوں۔"

"ارے نہیں، اسے نیچے اتار دو۔ یہ خود منہ ہاتھ دھو لے گی۔"

"اچھا!" اس نے ثانیہ کو نیچے کھڑا کیا پھر اس کا سر ہلاتے ہوئے بولی۔ "بھئی واہ ثانی بیٹا تو بڑا ہو گیا ہے۔"

"ابھی میں بڑی نہیں ہوئی۔ جب بڑی ہوں گی تو پاپا کے پاس امریکہ جاؤں گی۔"

ثانیہ کا ذہن یقیناً رات کی باتوں سے آزاد نہیں ہوا تھا۔ جبھی فوراً بولی تو مریم کچھ حیران سی ہو کر اس کی طرف دیکھنے لگی اور وہ طویل سانس لے کر بے بسی سے نفی میں سر ہلانے لگی۔

"جاؤ، ثانیہ منہ دھو کر آؤ۔" مریم نے ثانیہ کو بھیجا پھر اس کے پاس بیٹھتے ہوئے پوچھنے لگی۔ "ثانیہ کو اس کے پاپا کے بارے میں آپ نے بتایا ہے۔"

"رات وہ خود ہی سوال کرنے لگی تھی اس لیے مجھے بتانا پڑا۔ اور یہ کوئی چھپانے والی بات تو نہیں ہے۔ مریم! آخر کبھی نہ کبھی تو اسے اپنے باپ کے بارے میں پوچھنا ہی تھا۔"

"ہاں اور لگتا ہے آپ نے اس کی باتوں کا اثر لیا ہے۔" پھر اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر بولی۔

"زینب باجی! ابھی تو ابتداء ہے اور آپ ہمت ہارے دے رہی ہیں۔ آپ کو تو بہت حوصلے کی ضرورت ہے۔"

"مجھ میں حوصلہ ہے مریم! بس ایسا ہے کہ میں نے اس نہج پر کبھی سوچا نہیں تھا اس لیے ثانیہ کے منہ سے اچانک ایسی باتیں سن کر میں ڈسٹرب ہو گئی لیکن آئندہ ایسا نہیں ہو گا۔ پھر ثانیہ ابھی چھوٹی ہے سمجھدار ہو گی تو میں اس کے باپ کے بارے میں اسے سچ سچ بتا دوں

گی۔"

"مما! آج اسکول نہیں جانا۔" ثانیہ منہ ہاتھ دھو کر آئی تو پوچھنے لگی۔ وہ دونوں اس کی طرف متوجہ ہو گئیں۔

"نہیں بیٹا! آج آپ کی مما کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے، اس لیے چھٹی۔" پھر اُٹھ کر ثانیہ کا ہاتھ پکڑ کر کچن کی طرف جاتے ہوئے اس سے بولی۔

"میں اور ثانیہ ناشتا بنانے جا رہے ہیں۔ جب تک آپ بھی منہ ہاتھ دھو لیں۔" وہ سر ہلاتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔

پھر ناشتے کے بعد مریم ثانیہ کو لے کر نیچے چلی گئی اور اُسے خاص طور سے تاکید کر گئی کہ وہ ہر بات ذہن سے جھٹک کر کچھ دیر کے لیے سو جائے تا کہ رات کی نیند پوری ہو اور طبیعت کا بوجھل پن دور ہو جائے اور اس نے بڑی سعادت مندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس کی بات پر عمل کیا۔

پھر شام تک وہ نہ صرف بہت بہتر تھی بلکہ آئندہ کے لیے اپنے آپ کو ہر قسم کی صورت حال کا سامنا کرنے کے لیے تیار کر چکی تھی۔ اس نے سوچا تھا۔ مریم ٹھیک کہتی ہے کہ ابھی تو ابتداء ہے۔ اور آئندہ پتا نہیں اُسے کن کن مراحل سے گزرنا پڑے گا۔ بہر حال حالات کیسے بھی ہوں، وہ پھر کبھی اس طرح ہمت نہیں ہارے گی۔

سہ پہر میں ہی وہ نیچے چلی گئی اور آنٹی کے منع کرنے کے باوجود مریم اور عابدہ کا ہاتھ بٹانے لگی۔ اس دوران مریم کے ساتھ مل کر اس نے عابدہ کو خوب تنگ کیا کہ وہ بے چاری آخر میں ان دونوں سے خفا ہو کر اپنے کمرے میں چلی گئی تھی۔

"دیکھو جا کر کہیں رو کر تو نہیں رہی۔" اس نے مریم سے کہا۔

"ارے نہیں زینب باجی! روئے گی کیوں۔" وہ یقین سے بولی۔ "سب مصنوعی خفگی ہے جبکہ اندر ہی اندر تو لڈو پھوٹ رہے ہوں گے۔"

"ٹھیک کہتی ہو۔" وہ ہنسی اس وقت کال بیل بجنے سے دونوں ایک دم خاموش ہو گئیں۔ پھر مریم سرگوشی میں بولی۔

"میرا خیال ہے، وہ لوگ آ گئے ہیں۔" پھر اپنے امی، ابو کے ساتھ کچھ دوسری آوازیں سن کر بولی۔

"ہاں آ گئے ہیں۔ چلیں۔ آپ جلدی سے چائے کا پانی رکھ دیں۔ میں یہ چیزیں ٹرالی میں رکھ دیتی ہوں۔"

"تم پہلے جا کر اپنے جیجا جی کو سلام تو کر آؤ۔" وہ کیتلی میں پانی ڈالتے ہوئے بولی۔

"میرا خیال ہے۔ ٹرالی لے کر ہی جاؤں۔"

"اور عابدہ؟"

"اُسے اگر بلایا گیا تو وہ چائے لے کر آ جائے گی اور آپ بھی اس کے ساتھ ضرور آیئے گا۔"

"نہیں بھئی، مجھے تو تم معاف ہی رکھو۔" اُسی وقت آنٹی آ گئیں۔ مریم کو ٹرالی اندر لے جانے کے لیے کہا پھر اُس سے کہنے لگیں۔

"بیٹا! تم عابدہ کو اندر لے آؤ۔ وہ لوگ اُسے دیکھنا چاہتے ہیں۔"

"جی!" وہ اسی قدر کہہ سکی اور پلٹ کر چائے دم کرنے لگی۔ پھر ٹی پاٹ ٹرے میں رکھ کر اندر سے عابدہ کو لے آئی اور ٹرے اٹھا کر اس کے ہاتھوں میں تھماتے ہوئے بولی۔

"چلو مہمان تمہارے ہاتھوں کی بنی چائے پینا چاہتے ہیں۔"

"لیکن مجھے ڈر لگ رہا ہے۔"

"ارے اس میں ڈرنے کی کیا بات ہے۔ چلو، میں بھی تمہارے ساتھ چل رہی ہوں۔"

اس نے یوں لاپروائی سے کہا جیسے یہ کوئی بات ہی نہ ہو۔ پھر آہستگی سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے چلنے کا اشارا کیا اور خود بھی اس کے ساتھ چل پڑی۔ عابدہ کے ہاتھوں میں ٹرے تھی، اس لیے اس نے آگے بڑھ کر جیسے ہی پردہ ہٹایا۔ سامنے علی مراد کو بیٹھے دیکھ کر بُری طرح چونکی۔ غنیمت تھا کہ وہ اس وقت کسی اور طرف متوجہ تھا۔ وہ فوراً اوٹ میں ہو گئی اور جیسے ہی عابدہ اندر داخل ہوئی اور وہیں سے پلٹ کر دوبارہ کچن میں آ گئی۔ اس کا دل اچانک بڑے زور زور سے دھڑکنے لگا تھا۔ اور علی مراد کی یہاں موجودگی کسی طرح بھی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔

وہ کس حیثیت سے یہاں آیا ہے اور کیوں؟ وہ یہی سوچ رہی تھی کہ مریم آ گئی۔

"کہاں ہے زینب باجی آپ یہاں بیٹھی ہیں؟ آیئے ناں آپ کو مہمانوں نے

ملواؤں۔" اس نے چونک کر دیکھا تو بمشکل سنبھل کر بولی۔

"نہیں مریم! مجھے اچھا نہیں لگے گا۔"

"کیا اچھا نہیں لگے گا؟"

"تم سب کے درمیان میں اجنبی سی۔"

"آپ اپنے آپ کو اجنبی سمجھتی ہیں۔" مریم روٹھنے لگی۔ "ہم نے تو پہلے دن ہی آپ کو اپنی بڑی بہن کا درجہ دے دیا تھا۔"

"میں بھی ایسا ہی سمجھتی ہوں لیکن پلیز اس وقت مجھے مجبور مت کرو۔" وہ منت سے بولی۔

"آخر کیوں؟"

"بس اس وقت میں کچھ عجیب سا محسوس کر رہی ہوں۔ شاید مہمانوں سے ٹھیک طرح سے نہ مل سکوں۔ آئندہ..... آئندہ ضرور ملوں گی۔ اب تو یہ آنا جانا رہے گا۔"

"ہاں اور آئندہ میں کوئی عذر نہیں سنوں گی۔"

"اچھی بات ہے۔" وہ زبردستی مسکرائی اور اس کے جاتے ہی بہت خاموشی سے اوپر چلی آئی۔

ابھی کچھ وقت پہلے ہی تو اس سے سوچا تھا کہ حالات خواہ کیسے بھی ہوں وہ ہمت نہیں ہارے گی اور اتنی جلدی حالات اسے آزمانے چلے آئے تھے۔ اسے علی مراد سے کوئی نسبت تھی یا نہیں، اس بات سے قطع نظر وہ بہرحال اس کا شوہر تھا اور اس کی یہاں موجود واقعی اچنبھے کی بات تھی۔ وہ اس وقت سے سوچ سوچ کر پریشان تھی۔ مسلسل ٹہلتے ہوئے اس کا ذہن بھی مسلسل اُلجھتا جا رہا تھا۔ شام ڈھلنے لگی تھی اور رات کی سیاہی پر پھیلاتی چلی آ رہی تھی۔ جب مریم، ثانیہ کو گود میں اٹھائے آ گئی۔ وہ بہت خوش نظر آ رہی تھی۔ اور اپنی خوشی کا اظہار ثانیہ کو گدگدا کر رہی تھی۔

"مہمان چلے گئے۔" وہ یونہی سناٹوں میں گھری پوچھنے لگی۔

"ہاں اور اب وہ مہمان نہیں رہے۔ اپنے اپنے سے ہو گئے ہیں۔ کیونکہ ابھی جاتے جاتے عابدہ کو انگوٹھی بھی پہنا گئے ہیں۔" مریم نے بے حد خوش ہو کر بتایا۔

"اچھا مبارک ہو۔" وہ کوشش کے باوجود اپنی آواز میں خوشی کا تاثر پیدا نہیں کر سکی۔

پھر بظاہر سرسری انداز میں پوچھنے لگی۔

''کیا نام ہے لڑکے کا اور کیا کرتا ہے؟''

''انور بھائی ایک نیم سرکاری ادارے میں اکاؤنٹنٹ ہیں۔''

''کون کون آیا تھا؟'' وہ اندر ہی اندر اپنے آپ کو اطمینان دلاتے ہوئے پوچھنے لگیں۔

''انور بھائی کے والدین، دو بہنیں اور ایک اُن کا دوست تھا۔

''دوست۔'' وہ طویل سانس لے کر یونہی آسمان پر دور دور تک نظریں دوڑانے لگی پھر اس کی طرف دیکھا تو بولی۔

''یہ تم ثانیہ کو ہر وقت گود میں مت اٹھایا کرو۔ اب یہ بڑی ہوگئی ہے۔''

''کوئی نہیں۔ ابھی ننھی سی تو ہے۔ ہے ناں ثانی؟'' مریم نے تصدیق کے لیے ثانیہ سے پوچھا تو وہ اثبات میں سر ہلانے لگی۔

☆☆☆

وہ ایم اے کے امتحانوں سے فارغ ہوئی ہی تھی کہ گرمیوں کی چھٹیوں کے سبب اسکول بند ہوگئے اور وہ ایک دم جیسے فارغ ہی فارغ ہوگئی۔ تب اُس نے اچانک اماں اور بابا سائیں کے پاس جانے کا پروگرام بنالیا۔ پچھلے سال بھی وہ بس سوچتی رہ گئی تھی لیکن جا نہیں سکی تھی۔ اس لیے اب اس نے پروگرام بناتے ہی تیاری کرلی۔

''زینب باجی! ہمارا بالکل دل نہیں لگے گا۔ خاص کر ثانیہ کے بغیر۔'' مریم اس کے جانے کا سن کر ہی اداس ہو رہی تھی۔

''بس دو مہینے کی تو بات ہے۔ پلک جھپکتے میں گزر جائیں گے۔''

''جی نہیں۔ دو مہینے بہت زیادہ ہوتے ہیں یعنی پورے ساٹھ دن اور میں تو ایک دن ثانیہ کو نہ دیکھوں تو مجھے چین ہی نہیں آتا۔''

''ثانیہ بھی تم سے بہت مانوس ہوگئی ہے۔'' وہ مسلسل اپنے کام میں مصروف رہی۔

''تو پھر آپ اسے یہیں چھوڑ جائیں۔'' وہ ایک دم سر اٹھا کر دیکھنے لگی تو مریم پتا نہیں کیا سمجھی۔ سر جھکا کر بولی۔

''شاید میں نے کچھ غلط کہہ دیا ہے۔''

''ارے نہیں۔'' وہ اٹھ کر اس کے پاس آگئی۔ ''میں ضرور ثانیہ کو تمہارے پاس چھوڑ دیتی لیکن مسئلہ یہ ہے کہ اماں اور بابا سائیں بھی اسے دیکھنا چاہتے ہوں گے۔''

''یہ تو ہے۔'' مریم نے پرسوچ انداز میں سر ہلایا۔

''بہر حال تم اداس مت ہو۔ میں جلد آنے کی کوشش کروں گی۔''

''پکی بات ہے ناں۔''

''بالکل پکی بات اور اب جلدی سے ثانیہ کو تیار کردو۔ ہمارے جانے کا وقت ہو رہا ہے۔''

اُس نے اٹھ کر ثانیہ کو کپڑے اسے دیے پھر سوٹ کیس بند کرنے لگی۔ اس کے بعد نیچے اتر کر آئی تو آنٹی عابدہ بھی ویسی ہی باتیں کرنے لگیں۔ اصل میں اس گھر میں کوئی بچہ نہیں تھا۔ اس لیے سب ثانیہ سے بہت پیار کرنے لگے تھے۔

تنہائیوں کے مارے اماں اور بابا سائیں اس کی آمد پر بے حد خوش ہوئے۔ سونے آنگن میں جیسے بہار اُتر آئی تھی۔ وہ یہاں ماما مامی کے گھر تھی تو ہر دوسرے دن چکر لگا لیا کرتی تھی۔ اس لیے کبھی انہیں احساس نہیں ہوا کہ انہوں نے بیٹی بیاہ دی ہے اور اب تو وہ پورے ڈھائی سال بعد آئی تھی۔ کبھی اس کا چہرا ہاتھوں کے پیالے میں لیتیں اور کبھی ثانیہ کو گود میں بھر کر یوں پیار کرتیں جیسے زینب چھوٹی ہوگئی ہو۔ عجیب انداز تھا ان کا۔ ثانیہ کا منہ چومتیں اور کہتیں بالکل میری زینب ہے۔ دن بھر یہی کچھ ہوتا رہا۔ وہ وقفے وقفے سے سب کا حال احوال بھی پوچھتی رہی۔ ماما مامی کے بارے میں اس نے قصداً نہیں پوچھا تھا لیکن اماں خود ہی بتانے لگیں۔

''کوئی چھ آٹھ مہینے پہلے علی مراد آیا تھا۔ ولایت سے بڑھ کر آیا ہے۔ بتا رہا تھا اُدھر شہر میں کوئی بڑا افسر لگ گیا ہے۔''

''اچھا!'' اس کی نظروں میں وہ منظر گھوم گیا جب اس نے عابدہ کے گھر میں اسے دیکھا تھا! صحت مند توانا مرد کے روپ میں۔ اور اماں کہہ رہی تھیں۔

''وہ تو تیرے ماما، مامی کو بھی اپنے ساتھ شہر لے جانا چاہتا تھا پر وہ دونوں مانے نہیں۔''

''کیوں..... کیوں نہیں مانے؟'' وہ چونک کر پوچھنے لگی۔

"دھیے! اپنا گھر کون چھوڑتا ہے۔ یہاں اپنی پوری برادری ہے۔ کوئی دکھ سکھ ہو، سب ساتھ رہتے ہیں اور شہر میں کون ہے۔ بندہ اکیلا دیواروں سے باتیں کرتا رہے۔"

"نہیں اماں! وہاں بھی ہمارے ہی جیسے لوگ رہتے ہیں۔" وہ دفاع کرتے ہوئے بولی۔ "جہاں میں رہتی ہوں، وہ لوگ بہت اچھے ہیں۔ بالکل اپنوں کی طرح ذرا بھی اجنبیت کا احساس نہیں ہوتا۔"

"سب تو اچھے نہیں ہوتے۔"

"سب اچھے ہوتے ہیں اماں! پھر یہ تو ہم پر منحصر ہے ہم اچھی طرح سے ملیں گے تو دوسرا بھی محبت سے ملے گا۔"

"یہ تو ٹھیک کہتی ہے۔" اماں نے پرسوچ انداز میں سر ہلایا پھر آواز دھیمی کر کے رازداری سے پوچھنے لگیں۔ "شہر میں علی مراد تیرے پاس آتا ہے۔"

"نہیں۔"

"دھیے! جب ایک ہی شہر میں رہتے ہو تو ساتھ کیوں نہیں رہتے۔"

"ہم ساتھ نہیں رہ سکتے اماں!" اس کے انداز میں آپ ہی آپ ناگواری سمٹ آئی۔ جیسے اس موضوع پر بات نہ کرنا چاہتی ہو۔

"کیوں ساتھ نہیں رہ سکتے؟"

"ہمارے راستے شروع ہی سے الگ تھے لیکن آپ لوگوں نے نہیں سمجھنا۔ خیر چھوڑ دیں۔ یہ بتائیں۔ علی مراد نے میرے بارے میں پوچھا تھا؟" وہ بہت دیر سے یہ بات جاننا چاہ رہی تھی۔

"ہاں بلکہ یہاں تو بہت غصے میں آیا تھا کہ تو اس کی اجازت کے بغیر شہر کیوں گئی۔"

"اچھا!" وہ خوامخواہ ہنسی۔ "ذرا میرے سامنے تو یہ بات کہے۔ مجھے اس کی اجازت کی ضرورت ہے ہونہہ!"

"تو اس کی بیوی ہے۔"

"نہیں اماں! اس نے صاف انکار کر دیا تھا کہ اُسے میری اور بچی کی ضرورت نہیں ہے اور یہ بھی کہ وہ مجھے طلاق دے سکتا ہے۔"

"کیا کہہ رہی ہے!" اماں ششدر سی ہو کر بولیں۔ "علی مراد طلاق دے گا۔"

"بے جوڑ شادیوں کا یہی انجام ہوتا ہے۔ یہ تو آپ کو پہلے سوچنا چاہیے تھا کہ یہ آپ کا دور نہیں ہے جو عورت خاوند کو پاس پوس کر بڑا کرے پھر بڑے آرام سے دوسری عورت کے حوالے کر دے۔ اب زمانہ بدل گیا ہے۔ مرد بھی اس بات کو پسند نہیں کرتا کہ جس عورت کے سامنے وہ پل بڑھ کر جوان ہوا ہے۔ اسے بیوی بنا لے۔ اگر علی مراد مجھے طلاق دے دے گا تو اس میں کوئی اچنبھے کی بات نہیں ہے۔"

قدرے توقف کے بعد کہنے لگی۔

"پھر وہ اس گاؤں کا پروردہ بھی نہیں ہے جو سمجھوتے کی سوچے گا۔ پڑھ لکھ کر اور ترقی یافتہ ممالک دیکھ کر تو اس کے خیالات مزید بدل گئے ہوں گے۔ اور اگر اس نے معاشرے میں کوئی مقام بنا لیا ہے تو اسے اس مقام اور جس معاشرے میں رہ رہا ہے اس کے تقاضوں کو بھی نباہنا ہوگا۔" کچھ دیر خاموش رہ کر بولی۔

"علی مراد کو چھوڑیں، میں خود بھی اس بندھن کو نہیں نبھا سکتی۔"

"چھوری!" اماں کچھ کہنا چاہتی تھی کہ وہ بول پڑی۔

"یہ کوئی بڑی بات نہیں ہے اماں۔ جب دل نہیں ملتے۔ مزاج نہیں ملتا اور ذہن ایک دوسرے کو قبول نہیں کرتے تو کوئی زبردستی نہیں ہے کہ ہم ایک دوسرے کو برداشت کریں۔ ہمارا مذہب ہمیں اس بات کی اجازت دیتا ہے کہ صلح صفائی سے رہیں یا پھر ایک دوسرے کو الزام دیے بغیر الگ ہو جائیں۔"

"تیری باتیں میری سمجھ میں نہیں آتیں۔"

"چلیں چھوڑ دیں اور ذہن پر کوئی بوجھ نہ ڈالیں بس یہ سوچ لیں کہ اللہ جو کرے گا۔ بہتر کرے گا۔" پھر اس نے موضوع بدل دیا اور ادھر ادھر کی باتیں کر کے اماں کا دھیان بٹانے میں بھی کامیاب ہو گئی۔

برادری میں رفتہ رفتہ سب کو اس کی آمد کی خبر ہو گئی تو روزانہ ہی کوئی نہ کوئی اس سے ملنے آ جاتا۔ اس کے پیچھے لاکھ اس پر باتیں بنائی گئی ہوں لیکن اس کے منہ پر سب اسے سراہ رہے تھے۔ کہ اس نے اپنی زندگی بنانے کے لیے جو جدوجہد کی وہ لڑکیوں کے لیے مثال ہے۔ کم از کم آئندہ لڑکیاں اس طرح شوہروں کے انتظار میں بیٹھی نہیں رہ جائیں گی۔ وہ سب کی باتیں سنتی اور مسکراتی رہتی تھی۔ بعد میں جب اماں اسے بتاتیں کہ یہی

لوگ پہلے کیسی باتیں کرتے تھے تب بھی وہ کوئی خاص اثر نہیں لیتی تھی اور اماں سے بھی کہتی کہ وہ کسی کی باتوں پر کان نہ دھرا کریں۔

یوں سب سے ملنے ملانے میں دو مہینے گزرنے کا پتا بھی نہیں چلا اور اس نے واپسی کی تیار کر لی۔ اماں بے حد اداس ہو گئیں۔

''تیرے آنے سے رونق ہو گئی تھی چلی جائے گی تو گھر کاٹنے کا دوڑے گا۔''

''اسی لیے تو کہتی ہوں آپ اور بابا سائیں بھی میرے ساتھ چلیں۔'' وہ ان کے ہاتھ تھام کر بولی۔ ''یقین کریں اماں! یہاں کے مقابلے میں وہاں بہت آرام ہے۔''

''چھوڑو دھیے! ہم نے تو شروع سے ہی سنا ہے کہ شہروں میں سکون نہیں ہوتا۔''

''سکون اور اطمینان اپنے اندر ہوتا ہے اماں! باہر نہیں ڈھونڈا جاتا۔ بہر حال آپ وہاں آ کر ضرور دیکھیں اگر دل نہ لگے تو بے شک واپس آ جایئے گا۔''

''آئیں گے۔ تیرے بابا سائیں اور میں کچھ دنوں کے لیے آئیں گے۔'' اماں نے کہا پھر وہ دیر تک ان کے سینے سے لگی رہی تھی۔

☆☆☆

''زینب باجی!'' مریم نے اُسے دیکھتے ہی چیخ نما آواز کے ساتھ نعرہ بلند کیا تھا پھر بھاگ کر اس سے لپٹ گئی۔ ''ایمان سے باجی! آپ نے بہت بور کیا۔ اپنی بات پوری کی ناں۔ پورے دو مہینے بعد آئی ہیں۔''

''کیا کرتی، اماں تو اب بھی نہیں آنے دے رہی تھیں۔'' اس نے بمشکل اپنے آپ کو چھڑایا پھر آنٹی اور عابدہ سے مل کر کچھ دیر کے لیے وہیں بیٹھ گئی۔

''ثانیہ مجھے یاد کرتی تھی؟'' مریم ثانیہ کو گود میں لیتے ہوئے پوچھنے لگی۔

''بہت زیادہ بلکہ اکثر تمہارے پاس آنے کے لیے رونے لگتی تھی۔''

''بس تو اسے مجھے دے دیں۔''

''تمہاری ہی ہے۔'' وہ مسکرا کر بولی پھر اُٹھ کر کھڑی ہوئی۔ ''اچھا آنٹی! میں چلوں۔ بیگن کے سفر نے تھکا دیا ہے۔''

''بیٹھیں ناں۔ میں چائے بنا رہی ہوں۔''

''چائے اوپر ہی لے آنا۔ میں جب تک شاور لے لوں۔''

''اچھی بات ہے۔'' وہ ثانیہ کو لیے ہوئے کچن میں چلی گئی تو وہ اپنا سوٹ کیس اٹھا کر اوپر آ گئی۔

اسکول کھلنے میں ابھی کچھ دن باقی تھے اور ان چند دنوں میں اس نے اطمینان سے کچھ ادھورے کام مکمل کیے پھر عابدہ کی شادی ہونے والی تھی۔ اس کے لیے بھی اس نے ابھی سے تیاری کر لی۔ وہ اپنی اس زندگی سے غیر مطمئن تو نہیں تھی لیکن پوری طرح مطمئن بھی نہیں تھی۔ کسی کسی وقت خیال آتا کہ اگر زندگی کو اسی حد تک محدود رکھنا تھا تو پھر اپنا گھر چھوڑنے کی کیا ضرورت تھی۔ وہاں بھی وہ اسی طرح ایک اسکول میں پڑھا ہی رہی تھی۔ انہی دنوں اس کا ایم اے کا رزلٹ نکلا اور اپنی چوتھی پوزیشن دیکھ کر اس کی خوشی کی انتہا نہ رہی۔ اور اس تمام عرصے میں وہ پہلی بار نوعمر لڑکیوں جیسی حرکت کر گئی کہ سیڑھیوں میں چلاتی اور بھاگتی ہوئی آئی۔

''آنٹی میں نے چوتھی پوزیشن لی ہے۔'' اس نے دمکتے چہرے کے ساتھ بتایا۔

''مبارک ہو۔'' آنٹی کے ساتھ ساتھ عابدہ نے بھی اسے مبارکباد دی جبکہ مریم کہنے لگی۔

''میں پہلے مٹھائی کھاؤں گی پھر مبارکباد دوں گی۔''

''صرف مٹھائی!'' وہ بے حد خوش تھی۔ حاتم طائی کی قبر پر لات مارنے کو تیار۔

''چلیں، مٹھائی چھوڑیں۔ شام میں طارق روڈ چلیں گے۔ مجھے وہاں کی آئس کریم بہت پسند ہے۔''

''ہوں!'' آنٹی نے مریم کو گھورا تو وہ کہنے لگی۔

''مت ٹوکیں آنٹی! میری خوشی ہے پلیز اجازت دے دیں۔''

''بیٹا! یہ تو یونہی چٹوری ہے۔''

''کوئی نہیں۔'' مریم نے منہ پھلا لیا تو وہ اس کی خاطر آنٹی کو رام کرنے لگی اور آخر انہیں منا کر ہی دم لیا۔

وہ تینوں اکثر شاپنگ کے سلسلے میں قریبی مارکیٹ تک چلی جاتی تھیں لیکن گھر سے اتنی دور طارق روڈ پہلی مرتبہ آئی تھیں۔ پتا نہیں مریم نے یہاں کی آئس کریم پہلے کب

کھائی تھی جو اُسے اب تک یاد تھی۔ یا پھر اس نے یونہی کہہ دیا تھا۔ بہر حال آئس کریم واقعی لاجواب تھی۔ اس کے بعد فوراً گھر جانے کے بجائے وہ تینوں شوکیسوں میں سجے فیشن کے ملبوسات دیکھنے لگیں۔ گو کہ انہیں خریدنا کچھ نہیں تھا۔ لیکن مریم کا کہنا تھا کہ دیکھ لینے میں کیا حرج ہے جبکہ وہ اور عابدہ دھیمی آوازوں میں سوٹوں پر بنے ڈیزائن کے بارے میں میں ایک دوسرے کو بتانے لگیں کہ ڈیزائن کس چیز سے اور کس طرح بنایا گیا ہے۔ پھر شرٹ کی کٹنگ کس طرح کی گئی ہے وغیرہ وغیرہ۔

ایک جگہ اس نے محسوس کیا مریم بہت دیر سے خاموش ہے اور جب اس سے کچھ کہنے کے لیے ادھر ادھر دیکھا تو وہ موجود نہیں تھی۔ وہ عابدہ سے پوچھنا چاہتی تھی کہ ایک جگہ وہ کھڑی نظر آ گئی اور اس کے ساتھ یقیناً علی مراد تھا۔ جس پر نظر پڑتے ہی فوری طور پر سمجھ میں نہیں آیا تو جلدی سے ثانیہ کو گود میں اٹھایا اور عابدہ کا ہاتھ پکڑ کر دکان کے اندر داخل ہو گئی۔

''کیا لینا ہے؟'' عابدہ پوچھنے لگی۔

''باہر سوٹ اچھے ٹنگے ہوئے ہیں، ان میں اور کلر دیکھ لیتے ہیں۔ کوئی پسند آ گیا تو لے لوں گا۔'' اس نے کہا پھر ایک نظر شیشوں سے باہر ڈال کر دکاندار کی طرف متوجہ ہو گئی۔ پھر اسے کچھ مخصوص کلر نکالنے کے لیے کہا۔

''یہ مریم کہاں رہ گئی۔'' وہ بظاہر سوٹ دیکھنے میں مگن تھی اور عابدہ کو اتنی دیر بعد خیال آیا تو پوچھنے لگی۔ قصداً اَن سُنی کر گئی اور ایک سوٹ اس کے سامنے رکھتے ہوئے بولی۔

''دیکھو، یہ کیسا ہے۔''

''ہاں، اچھا ہے۔'' اسی وقت مریم نے دُکان کے اندر جھانک کر دیکھا اور اُن دونوں کو کھڑے دیکھ کر اطمینان کا سانس لیتے ہوئے قریب آ کر بولی۔

''کمال ہے، آپ لوگ مجھے چھوڑ کر چلے آئے۔ وہ تو اچانک نظر پڑ گئی ورنہ میں ڈھونڈتے ہوئے کہاں سے کہاں نکل جاتی۔'' وہ فوراً اس کی طرف متوجہ نہیں ہوئی۔ پہلے دکاندار کو سوٹ پیک کرنے کے لیے کہا پھر کاؤنٹر پر پے منٹ کرنے کے بعد مریم کو دیکھا۔ اس کا چہرا اَن کہی داستانیں سنا رہا تھا۔ اگر علی مراد کی جگہ کوئی اور ہوتا تو وہ اس کے چہرے پر لکھی تحریریں دلچسپی سے پڑھتی لیکن اب وہ اندر ہی اندر ڈوبنے لگی تھی۔

رات بہت دیر تک وہ سوچتی رہی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ مریم کو اس راستے

پر چلنے سے کیسے روکے۔ کیسے اُسے بتائے کہ جس شخص کے وہ خواب دیکھنے لگی ہے۔ وہ علی مراد ہے، ایک بچی کا باپ اور پتا نہیں اس بچی کے باپ نے اپنا تعارف کس انداز سے کرایا ہوگا۔ بہر حال مجھے اس سے کوئی غرض نہیں کہ علی مراد نے مریم کے سامنے اپنے آپ کو کیا ظاہر کیا ہے لیکن میں موقع دیکھ کر ضرور مریم کو بتاؤں گی۔ آخر میں اس نے سوچا اور قدرے اطمینان سے ہو گئی کہ مریم اب اتنی نادان بھی نہیں تھی کہ علی مراد کی اصلیت جان کر بھی نہ سنبھلتی۔

پھر اگلے کئی دن تک وہ خود بے حد مصروف رہی اس نے یونیورسٹی میں لیکچرر شپ کے لیے اپلائی کیا تھا۔ اس سلسلے میں فی الحال اس کی ساری توجہ اسی طرف تھی۔ پھر اس کی کوشش اور قسمت بھی مہربان تھی کہ اسے لیکچرر شپ مل گئی۔ یوں نئی جاب میں سیٹ ہونے اور اپنی ثانیہ کی نئی روٹین سیٹ کرنے میں کافی دن اُسے کسی بات کا ہوش ہی نہیں رہا۔

ثانیہ کے لیے کوئی خاص پرابلم نہیں تھی۔ صبح وہ خود اسے اسکول چھوڑ آتی۔ واپسی میں وہ عابدہ کے ساتھ آ جاتی تھی۔ پھر کیونکہ وہ سب گھر والوں سے مانوس تھی اس لیے اگر اسے یونیورسٹی سے آنے میں دیر بھی ہو جاتی تو وہ مریم کے ساتھ آرام سے رہتی تھی۔

بہر حال ثانیہ کا کوئی مسئلہ نہیں تھا لیکن وہ خود اپنی نئی جاب سے زیادہ نئے ماحول سے گھبرائی ہوئی تھی۔ گو کہ وہ اچھی میچور اور پر اعتماد تھی لیکن مخلوط ماحول یقیناً اس کے لیے نیا اور اجنبی تھا۔ اپنی اب تک کی زندگی میں اُس نے صرف بابا سائیں کو قریب سے دیکھا تھا۔ ان کی شفقتیں اور محبتیں بڑی شدت سے محسوس کی تھیں۔ ان کے علاوہ کوئی مرد اس کی زندگی میں نہیں آیا تھا۔ ایک علی مراد جو فقط ایک رات کا مہمان ہوا پل میں اسے لڑکی سے عورت تو بنا دیا لیکن اس کے خوابیدہ جذبوں کو بیدار کرنے کی کوشش نہیں کی۔ اس کے برعکس اس ڈھٹائی سے سارا الزام اس کے سر رکھا کہ وہ اپنی ہی نظروں میں گر گئی تھی۔ اور اس کا خیال تھا کہ وہ کبھی بھی علی مراد کے سامنے جم کر کھڑی نہیں ہو سکے گی۔ اس کا کیا بھروسا۔ اس کے منہ پر بھی کہہ سکتا تھا۔ میں نشے میں تھا، تم تو ہوش میں تھیں۔

اس تمام عرصے میں علی مراد کا یہ جملہ مسلسل اس کے لیے بازگشت بنا رہا تھا۔ اور شاید وہ اندر ہی اندر کچھ خوفزدہ سی تھی جبھی دوبارا سے دیکھنے کے باوجود اپنے اندر اتنی ہمت پیدا نہیں کر سکی کہ اس کے سامنے جا کھڑی ہو۔ اور یونیورسٹی میں تو کتنے بہت سارے لوگوں کا سامنا

تھا جو اگر علی مراد نہیں تھے تو اس جیسے ضرور تھے۔ جبھی وہ بہت گھبرائی ہوئی تھی اور اس کی ساری کوشش اس بات پر صرف ہو رہی تھی کہ اس کی یہ کمزوری کسی کی نظروں میں نہ آئے۔ پائے لیکن تاڑنے والے غضب کی نگاہ رکھتے ہیں۔ اُس روز ڈاکٹر یزدانی نے کہہ دیا۔

''لگتا ہے، آپ فرسٹ ٹائم گھر سے نکلی ہیں۔''

''جی۔'' وہ بے حد حیران ہوئی۔ سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی۔

''پہلے کہیں جاب کی ہے آپ نے؟'' وہ پوچھنے لگے۔

''میں اس سے پہلے اسکول میں پڑھاتی رہی ہوں۔''

''اچھا۔'' انہیں جیسے یقین نہیں آیا۔ اس پر نظریں جما کر کہنے لگے۔

''آپ یہاں کی نہیں لگتیں۔ میرا مطلب ہے کراچی کی۔''

''کیوں، کیا میں اُردو صاف نہیں بولتی؟''

''اردو تو ٹھیک ٹھاک بول لیتی ہیں لیکن لہجہ۔'' وہ خاموش ہو کر غالباً خود قیاس کرنے لگے اور وہ بول پڑی۔

''میں شہداد کوٹ سے آئی ہوں۔''

''اچھا ہاں۔'' وہ ہلکے سے مسکرا کر سر ہلانے لگے پھر پوچھا۔

''یہاں کراچی میں کب سے ہیں۔''

''تیسرا سال ہے۔''

''پھر تو اب تک آپ کو خاصا ایکٹو ہو جانا چاہیے تھا۔'' اس کے دیکھنے پر کہنے لگے۔

''یہاں کے ماحول کا تقاضا یہی ہے۔ زینب شاہ۔ اور جب آپ گھر سے نکلی ہی ہیں تو آپ میں اتنا حوصلہ ضرور ہونا چاہیے کہ ہر قسم کے حالات کا سامنا کر سکیں۔''

''ڈاکٹر یزدانی۔'' ہونٹوں کی بے آواز جنبش اور وہ سر جھکا گئی۔ کتنا عجیب سا لگ رہا تھا کہ کوئی شخص اس کی اندرونی کیفیات سمجھ کر بات کر رہا تھا۔

''جتنا پر اعتماد آپ اپنے کو ظاہر کرتی ہیں حقیقتاً آپ کو ایسا ہی ہونا چاہیے۔ اس نے بس ایک پل کو ذرا سی پلکیں اٹھائیں اور کبھی کبھی زندگی میں بس..... ایک پل اتنا زور آور ہوتا ہے کہ پوری حیات پر حاوی ہو جاتا ہے۔ پتا نہیں کیا ہوا تھا یا شاید کچھ بھی نہیں۔ بس اتنا تھا کہ زینب شاہ کی سماعتوں میں پہلے اس براق گھوڑے کی ٹاپیں گونجی تھیں جو وہ

برسوں پہلے چولہے کی راکھ کریدتے ہوئے سنا کرتی پھر اچانک آس پاس ایک نئی دنیا سج گئی تھی۔

''زینب، شاہ۔'' اس نے اندر ہی اندر دھیرے دھیرے اپنے آپ کو پکارنا شروع کیا لیکن لگتا تھا جیسے وہ کھو گئی ہو۔ اتنے بڑے ہجوم میں نہیں بلکہ سامنے بیٹھے اس تنہا شخص کی ذات میں۔

زندگی میں یہ موڑ آیا بھی تو کب جب وہ ایک بچی کی ماں تھی۔ اس میں اس کا کوئی دوش نہیں تھا۔ اگر بہت پہلے بھی ایسا کوئی موڑ آتا تب بھی اگر وہ بچی کی ماں نہیں تھی تو علی مراد کی بیوی تھی۔ اور یہ ایسی تلخ حقیقت جس نے خوابوں کو پلکوں تک اترنے سے پہلے ہی ریزہ ریزہ کر دیا تھا پھر اس کے بعد اس نے کبھی ان ریزوں کو چننے کی کوشش نہیں کی۔ ایک طرح سے خود پر زندگی کے دروازے بند کر دیے تھے اور گو کہ اس نے بہت پہلے ہی سوچ لیا تھا کہ وہ علی مراد کے ساتھ نہیں رہے گی لیکن یہ تو کبھی بھی نہیں سوچا تھا کہ کوئی دوسرا شخص اس کی زندگی میں داخل ہو سکتا ہے اور یہ ضروری تو نہیں کہ جس بات کا گمان نہ ہو، وہ ہو بھی ناں۔ ڈاکٹر یزدانی نے پتا نہیں کب اور کیسے اس کے اندر کی لڑکی کو پالیا تھا۔ جسے وہ اپنے طور پر وہ وہیں کہیں راکھ کے ڈھیر میں دفن کر آئی تھی۔

☆☆☆

وہ مریم اور علی مراد والی بات بھولی نہیں تھی بس وقتی طور پر ذہن سے نکل گئی تھی اور اس وقت اُسے گزشتہ بات بھی یاد آ گئی جب اس نے ایک بار پھر ان دونوں کو ساتھ دیکھا۔ اس روز اسے لائبریری سے کچھ کتابیں اشو کروانے میں دیر ہو گئی تھی، جس سے پوائنٹ مس ہو گیا اور وہ اسٹاپ پر کھڑی بس کا انتظار کر رہی تھی۔ جب وائٹ کرولا میں اس نے علی مراد کے ساتھ مریم کو بیٹھے دیکھا۔ اتفاق سے مریم نے بھی اسے دیکھ لیا تھا اور بے حد گھبرا کر اپنا رخ دوسری طرف موڑ لیا جبکہ وہ آج چونکی نہیں تھی بلکہ اُسے افسوس ہو رہا تھا کہ مریم اپنے گھر والوں کے اعتماد کو ٹھیس پہنچا رہی ہے۔ پہلے اس نے سوچا تھا کہ وہ مریم سے بات کرے گی لیکن آج جب مریم نے بھی اسے دیکھ لیا تھا تو اس نے قصداً خاموشی اختیار کر لی تھی۔ دو دن دانستہ نیچے نہیں گئی نہ ہی مریم اس کے پاس آئی۔

تیسرے دن چھٹی تھی۔ اور چھٹی کا دن ہفتے بھر کے جمع شدہ کاموں کی نذر ہو جاتا

تھا۔ سارا دن وہ مصروف رہی۔ شام میں چائے کا کپ لے کر وہیں صحن میں رکھی کرسی پر آ کر بیٹھی ہی تھی کہ مریم آ گئی اور اسے دیکھتے ہی اس کی نگاہوں میں تین روز پہلے کا منظر گھومنے لگا۔ پھر بھی انجان بن گئی اور ہمیشہ والے انداز سے بولی۔

''اگر چائے پیو گی تو پلیز کپ میں ڈال کر لیتی آؤ، کیتلی میں کافی چائے ہے۔''

مریم سیدھی کچن میں چلی گئی پھر چائے لے کر دوسری کرسی کھینچتے ہوئے اس کے پاس آ بیٹھی تو وہ کہنے لگی۔

''ثانیہ کو نہیں لائیں؟''

''وہ ابو کے ساتھ باہر گئی ہے۔''

''بہت تنگ کرنے لگی ہے تم سب کو۔''

''نہیں۔'' مختصر جواب دے کر مریم نے چائے کا کپ ہونٹوں سے لگا لیا۔ تو وہ یونہی سر اونچا کر کے آسمانی پر اُڑتی اُکاڈ کا پتنگوں کو دیکھنے لگی۔

''آپ پوچھیں گی نہیں کہ اُس روز میرے ساتھ کون تھا۔'' جس طرح مریم نے اچانک کہا اسی طرح وہ ایک دم اسے دیکھنے لگی تھی۔ پھر فوراً سنبھل کر بولی۔

''تم جانتی ہو اُسے؟''

''ہاں، اُس نے اپنے بارے میں مجھے سب کچھ بتایا ہے۔ کچھ بھی نہیں چھپایا۔''

''مثلاً کیا؟'' وہ پوری طرح اس کی طرف متوجہ ہو گئی۔

''وہ شادی شدہ اور ایک بچے کا باپ ہے۔''

''تمہارے نزدیک اس بات کی کوئی اہمیت نہیں۔'' اس کے لہجے میں آپ ہی آپ تاسف سمٹ آیا۔

''اہمیت ہوتی اگر جو بیوی بچہ اس کے ساتھ ہوتے۔ وہ انہیں چھوڑ چکا ہے۔'' پھر اُس کے کیوں کہنے سے پہلے ہی تفصیل بتاتے ہوئے کہنے لگی۔

''اصل میں اس کے ماں باپ نے اس کی شادی ایک جاہل اور گنوار لڑکی سے کر دی تھی۔ جبکہ وہ خود امریکہ سے اقتصادیات میں ڈاکٹریٹ کر کے آیا ہے اور یہاں بہت اچھے عہدے پر فائز ہے۔ وہ کسی طرح اس لڑکی سے نباہ نہیں کر سکتا تھا۔ اس کا کہنا ہے کہ وہ کبھی بھی اس شادی کے لیے تیار نہیں تھا۔ بس والدین کی ضد کے آگے مجبور ہو گیا۔ وہ چاہتے تھے

کہ وہ امریکہ جانے سے پہلے شادی کر لے اور یوں اس کے باپ نے زبردستی، اپنی بھانجی اس کے پلے باندھ دی۔ جو کسی طرح بھی اس کے قابل نہیں تھی۔'' قدرے توقف کے بعد اپنا خیال ظاہر کرتے ہوئے بولی۔

''میں سمجھتی ہوں یہ ڈاکٹر علی کے ساتھ واقعی زیادتی ہے۔ وہ اتنا ایجوکیٹڈ اور نفیس بندہ اور اس کے ساتھ ایک جاہل گنوار لڑکی کا تصور عجیب سا لگتا ہے وہ اپنی زندگی کے اس المیے پر بہت ٹوٹ پھوٹ گیا ہے زینب باجی۔ اگر اُسے سہارا نہ ملا تو وہ بکھر جائے گا۔''

''ہاں علی مراد۔'' وہ طویل سانس لے کر سوچنے لگی۔ ''تھوڑا بہت جھوٹ تو چل ہی جاتا ہے۔ یہ بھی غنیمت ہے کہ تم نے اپنا شادی شدہ ہونا چھپایا نہیں۔''

''آپ کچھ کہیں گی نہیں۔'' مریم اُسے سوچتے دیکھ کر پوچھنے لگی۔

''میں کیا کہوں۔ البتہ تم یہ بتاؤ کہ کس حد تک سنجیدہ ہو۔ میرا مطلب ہے محض اُسے سمیٹنا چاہتی ہو یا کوئی اور جذبہ بھی ہے۔''

''میں آپ سے کچھ نہیں چھپاؤں گی باجی! میں اُسے بہت پسند کرتی ہوں۔ اور اب تو مجھے لگتا ہے کہ اُس کے بغیر میری زندگی میں کچھ بھی نہیں۔''

''کیا وہ اپنی بیوی کو باقاعدہ طلاق دے چکا ہے۔'' وہ کسی خیال کے تحت پوچھنے لگی۔

''پتا نہیں۔''

''تو اس سے کہو، پہلے اپنی بیوی کو باقاعدہ طلاق دے پھر تم اس سے شادی کرو گی۔''

''نہیں زینب باجی، میں ایسا نہیں کہہ سکتی۔''

''کیوں؟'' وہ واقعی حیران ہوئی۔

''اس لیے کہ میں نے اس نہج پر سوچا تھا اور مجھے وہ لڑکی انتہائی مظلوم لگی۔ پھر میرے دل نے یہ گوارا نہیں کیا کہ میں اس مظلوم پر اپنی طرف سے کہہ کر مزید کوئی ظلم کراؤں۔''

''تو کیا اس کے شوہر سے شادی کر کے تم اس پر ظلم نہیں کرو گی۔'' وہ عجیب سی ہنسی کے درمیان بولی۔

''نہیں۔ اس لیے کہ ڈاکٹر علی ہر صورت دوسری شادی کرے گا۔ میں نہیں تو کوئی اور سہی۔''

''یہ تو ہے جب وہ فیصلہ کر ہی چکا ہے تو پھر کوئی اور کیوں تم کیوں نہیں۔'' وہ تصور کی

آنکھ سے اُسے علی مراد کے پہلو میں دیکھنے لگی اور جو اُسے علی مراد سے کوئی نسبت ہوتی تو ضرور دل دکھتا لیکن ایسا کوئی ربط تو شروع ہی سے نہیں تھا۔ اور پھر وہ اوّل روز سے ہی جانتی تھی کہ کبھی نہ کبھی ایسا ضرور ہوگا۔ اس کے لیے وہ ذہنی طور پر تیار تھی۔ بس پھوپھی مراداں نہیں بننا چاہتی تھی اس لیے برادری سے نکل آئی تھی۔

''اس طرح کیا دیکھ رہی ہیں۔'' مریم اپنے چہرے پر جمی اس کی نظروں سے گھبرا کر بولی۔

''کیا میں غلط کر رہی ہوں؟''

''غلط یا صحیح کا فیصلہ میں نہیں کر سکتی مریم۔ تم خود سمجھدار ہو یا پھر تمہارے والدین جو مناسب سمجھیں گے کریں گے۔'' وہ سہولت سے اپنا دامن بچا گئی۔ پھر قدرے توقف کے بعد ہلکے پھلکے انداز میں بولی۔

''ایک مزے کی خبر سناؤں تمہیں۔ وہ علی مراد بھی دوسری شادی کر رہا ہے۔''

''کیا۔'' مریم چونکی۔ ''لیکن کیوں۔''

''ظاہر ہے ابھی اس کی شادی کی عمر ہے۔''

''شادی کی عمر ہے تو باجی آپ بھی تو اتنی اسمارٹ ہیں۔''

''اسمارٹ ہوں تو کیا ہوا۔ ہوں تو اس سے بڑی۔ اور غالباً وہ میرے ساتھ چل کر لوگوں کے ایسے ریمارکس نہیں سننا چاہتا کہ علی مراد اور اس کے بے بے۔'' وہ اپنی بات پر خود ہی محظوظ ہو کر ہنسی۔

''آپ کو اس کی اس حرکت سے افسوس نہیں ہو رہا؟'' مریم اسے ہنستے دیکھ کر تعجب سے پوچھنے لگی۔

''نہیں بلکہ مجھے خوشی ہے کہ اس نے ایک اچھی لڑکی کا انتخاب کیا ہے۔'' وہ اس کے پورے سراپے پر نظر ڈال کر بولی۔

''آپ سے اچھا کون ہوگا باجی! اگر مجھے مل جائے تو میں ضرور اس سے کہوں گی کہ وہ

بہت بڑی غلطی کر رہا ہے۔'' وہ کچھ کہنا چاہتی تھی کہ عابدہ اور ثانیہ کو آتے دیکھ کر اُن کی طرف متوجہ ہوگئی۔

''ارے آپ کو پتا ہے باجی، اگلے جمعے کو عابدہ کی شادی کی تاریخ رکھی جائے گی۔'' مریم کو اچانک یاد آیا تو بتایا۔

''اچھا۔'' اس نے اشتیاق ظاہر کیا۔ پھر دیر تک وہ اور مریم، عابدہ کو چھیڑنے کے ساتھ ساتھ شادی میں پہننے والے کپڑوں پر ڈسکس کرتی رہی تھیں۔

☆☆☆

اُس روز ثانیہ پھر اپنے پاپا کی باتیں کرنے لگی تھی اور اسے تو وہ بڑے تسلی بخش جواب دے کر مطمئن کرتی رہی لیکن اندر ہی اندر بہت اُلجھنے لگی تھی۔ ایک بار خیال آیا علی مراد یہیں کہیں موجود ہے۔ وہ ثانیہ کو اس سے ملوا دے لیکن پھر فوراً علی مراد کی بات یاد آئی۔

''مجھے تم سے اور تمہاری بچی سے کوئی لگاؤ نہیں۔'' اس سے سر جھٹک کر سوچا۔

''نہیں، ابھی ثانیہ چھوٹی ہے۔ کچھ نہیں جانتی۔ ایسا نہ ہو۔ یہ تو شوق میں پاپا پاپا کہتے ہوئے اس کی طرف بڑھے اور جواب میں وہ اُسے جھڑک دے ایسی صورت میں بچی یقیناً دلبرداشتہ ہوگی اور وہ اپنی بچی کے ساتھ ایسا سلوک ہرگز برداشت نہیں کر پائے گی۔''

اگلے دن وہ بظاہر بڑی نارمل سی تھی لیکن ایک شخص ایسا بھی تھا جو بہت خاموشی سے اس کے اندر تک سفر کر آتا تھا اور وہ تھے ڈاکٹر یزدانی۔

''کچھ پریشان ہیں۔'' پہلے گہری نظر سے اس کا جائزہ لیا پھر سرسری انداز میں پوچھا۔

''نہیں۔'' وہ سچ مچ اُن سے ڈرنے لگی تھی۔ قصداً اُن کی طرف دیکھنے سے گریز کرتی۔

''آپ واحد خاتون ہیں زینب شاہ جو جھوٹ بولتے ہوئے بھی اچھی لگتی ہیں۔''

''جی۔'' وہ بے اختیار سر اُٹھا کر انہیں دیکھنے لگی۔

"جی۔" وہ اس کی آنکھوں میں دیکھ کر ذرا سا مسکرائے۔

"عجیب شخص ہے۔" اس نے نظریں چرا کر سوچا۔

"پتا نہیں کیوں میری کھوج میں ہے اور مجھے کم از کم اس سے نہیں چھپنا چاہیے۔ اپنے بارے میں سب کچھ سچ سچ بتا دینا چاہیے تا کہ کسی پیش رفت سے پہلے وہ اچھی طرح سوچ لے۔"

"آپ کیا سوچنے لگیں۔" انہوں نے چونکا دیا۔

"کچھ نہیں۔" وہ بے بسی سے نفی میں سر ہلانے لگی۔

"آپ کو پتا ہے زینب شاہ، میں نے اب تک شادی نہیں کی۔" وہ شاید اس کا دھیان بٹانے کی خاطر اپنے بارے میں بات کرنے لگے۔

"کیوں؟" اس نے بلا ارادہ پوچھ لیا۔

"اس لیے کہ میں نے بہت پہلے ذہن کے کینوس پر ایک تصویر بنائی تھی۔ پھر اُسے اپنی مرضی میرا مطلب ہے، اپنے پسند کے رنگوں سے سجایا تھا۔ اس کے بعد عمر گزری اسے کھوجتے کھوجتے۔" اس کے خاموش رہنے پر کہنے لگے۔

"آپ پوچھیں گی نہیں کہ میں نے اُسے کھوج لیا یا نہیں۔" اور اب وہ اتنی نادان بھی نہیں تھی۔ اُن کی آنکھوں کے رنگ دیکھ کر ہی جان گئی کہ اس کے پوچھنے پر وہ کہہ دیں گے ہاں، میں نے اُسے کھوج لیا اور وہ تم ہو زینب شاہ۔ اور وہ نہیں چاہتی تھی کہ پہلے وہ اعتراف کریں اور بعد میں اس کی حقیقت جان کر نظریں چراتے پھریں۔ اس لیے اُٹھتے ہوئے بولی۔

"میں چلوں ڈاکٹر یزدانی، مجھے کلاس لینی ہے۔"

"اچھا۔" انہوں نے گھڑی کی طرف دیکھا پھر ہلکے سے سر ہلایا تو وہ ان کے پاس چلی آئی۔ اور اُسی روز اس نے سوچ لیا کہ وہ پہلی فرصت میں ڈاکٹر یزدانی کو اپنے بارے میں بتائے گی کہ وہ نہ صرف شادی شدہ بلکہ ایک بچی کی ماں بھی ہے۔ پھر اگلے روز وہ یونیورسٹی

نہیں گئی اور اسے سے اگلے روز اس کی توقع کے عین مطابق ڈاکٹر یزدانی پوچھنے لگے۔

"آپ کل کیوں نہیں آئی تھیں۔"

"میری بچی کی طبیعت خراب تھی۔" اس نے کل سارا دن جو سوچا تھا، وہ فوراً کہہ دیا۔ پھر اپنی بات کا ردِ عمل دیکھنے کے لیے اُن پر نظر ڈالی تو خود ہی اندر ہی اندر خجل سی ہو گئی، کیونکہ وہ نہ چونکے تھے نہ حیران ہو کر اس کی طرف دیکھا تھا۔ بلکہ یوں سنا جیسے اُن۔

"کیا ہوا تھا اُسے اور اب کیسی ہے۔"

"معمولی بخار تھا اب ٹھیک ہے۔"

"ڈاکٹر کو دکھایا؟"

"جی۔" وہ کچھ دیر تک اس کی طرف دیکھتے رہے پھر کہنے لگے۔

"مائیں بھی عجیب ہوتی ہیں۔ بچوں کی ذرا ذرا سی تکلیف پر تڑپ اٹھتی ہیں۔ اور اس سے اپنا ہوش ہی بھلا دیتی ہیں۔ حالانکہ انہیں سوچنا چاہیے کہ جس طرح انہیں بچے کی ضرورت ہے بچے کو اس سے کہیں زیادہ اُن کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور انہیں بچوں ہی کی خاطر اپنا خیال ضرور رکھنا چاہیے۔" وہ اُن کی بات کے جواب میں کیا کہتی۔ خاموش ہی رہی تب انہوں نے پوچھا۔

"کتنے بچے ہیں آپ کے؟"

"بس ایک بیٹی ہے۔"

"اور آپ کے شوہر کہاں ہوتے ہیں، میرا مطلب ہے کیا کرتے ہیں۔"

"میرے خدا!" اس کے اندر ٹوٹ پھوٹ ہونے لگی۔ بات یوں بڑھے گی یہ تو اس نے سوچا ہی نہیں تھا۔

"کوئی پرابلم ہے؟" اُسے راہِ فرار ڈھونڈتے دیکھ کر پوچھنے لگے۔

"جی..... نہیں۔" شاید بتانا چاہتی تھی اور شاید بتانے سے قاصر بھی تھی۔ پھر وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے اُٹھ کھڑی ہوئی۔

"بیٹھ جائیں زینب شاہ۔" اُن کے لہجے میں تحکم نہیں تھا۔ اصرار بھی نہیں تھا۔ پھر بھی پتا نہیں کیا بات تھی کہ وہ اپنے آپ کو بے بس محسوس کرتے ہوئے بیٹھ گئی۔

"چائے چلے گی۔" انہوں نے پوچھا اور اس کے جواب کا انتظار کیے بغیر ملازم کو بلا کر چائے لانے کے لیے کہا پھر کسی کتاب میں مصروف ہو گئے۔ ملازم چائے رکھ کر چلا گیا تب کتاب بند کر کے ایک طرف رکھتے ہوئے سرسری انداز میں بولے۔

"کیا آپ دونوں میں علیحدگی ہو گئی ہے؟"

"علیحدگی کی بات تو جب ہو، جو ہم کبھی ساتھی رہے ہوں۔ ہم تو کبھی ساتھ رہے ہی نہیں۔" سامنے بیٹھا شخص پتا نہیں ساحر تھا یا، پلٹا ٹائر کرنا جانتا تھا کہ وہ اپنی کتابِ زندگی کا ورق ورق کھولتی چلی گئی آخر میں کہنے لگی۔

"میرا خیال تھا، میں نے جینے کا ڈھنگ سیکھ لیا ہے اور اب بقیہ زندگی سہولت سے کٹ جائے گی لیکن جب ثانیہ اپنے باپ کے بارے میں پوچھتی ہے تو میں بے حد ڈسٹرب ہو جاتی ہوں۔ مجھے خیال آتا ہے کہیں ایسا نہ ہو علی مراد بچی کو دھتکار دے اور میری بچی ٹوٹ پھوٹ جائے۔" وہ خاموش ہو گئی اور فوراً وہ بھی کچھ نہیں بولے۔ کتنے پل یونہی خاموشی کی نذر ہو گئے پھر وہ جیسے سوچ کر کہنے لگے۔

"کیا ضروری ہے کہ ثانیہ کو باپ کی صورت میں صرف علی مراد ہی ملے۔ میرا مطلب ہے کوئی اور۔"

"نہیں ڈاکٹر یزدانی۔" وہ فوراً بول پڑی۔

"میں نے اس طرح کبھی نہیں سوچا۔"

"اب تک نہیں سوچا ناں لیکن اب ضرور سوچیں اس لیے زینب شاہ کہ کوئی بھی شخص خاص طور سے عورت کے لیے ایک طویل عمر تنہا گزارنا بے حد دشوار ہے۔ پھر آپ کے پاس بیٹی ہے۔ جو اگر آج چھوٹی ہے تو کل بڑی بھی ہو گی اور اس وقت آپ محسوس کریں گی کہ اس کے لیے صرف آپ کی پناہ گاہ کافی نہیں ہے۔" قدرے توقف کے بعد کہنے لگے۔

"ویسے تو آپ کو بھی سہارے کی ضرورت ہے زینب شاہ۔ حیرت ہے کہ آپ نے اب تک اس ضرورت کو محسوس نہیں کیا۔ سچ سچ بتائیں قصداً اپنی ذات سے نظریں چراتی رہی ہیں یا اپنے معیار کا کوئی ملا نہیں۔"

"مجھے کبھی ایسا خیال نہیں آیا۔" وہ صاف گوئی سے بولی۔ "جب علی مراد سے میری شادی ہوئی تھی، اسی وقت ہی میں نے سوچ لیا تھا کہ مجھے اس کے ساتھ نہیں رہنا اور میں نے اپنی زندگی کے لیے ایک پلان بنا لیا تھا لیکن اُس پلان میں کہیں کسی مرد کا گزر نہیں تھا۔ اس کے بعد جب ثانیہ میری زندگی میں آئی تو میری ساری سوچیں اُسی کے گرد گھومنے لگیں۔"

"کمال ہے، زندگی کی اتنی بڑی حقیقت کو آپ نظر انداز کر گئیں۔ پہلے اپنے لیے اور اب بیٹی کے لیے۔" کچھ دیر..... خاموش ہو کر اُسے دیکھتے رہنے پھر کہنے لگے۔

"قصور آپ کا نہیں ہے۔ اگر علی مراد نے ہی کبھی انجانے میں ہی سہی، احساسات کو نرمی سے چھو لیا ہوتا یا محبتوں کی ہی کوئی چھب دکھلائی ہوتی تو آپ اپنی ذات میں یوں مقید نہ ہو جاتیں۔ بلکہ زندگی میں اور جو بے شمار رنگ ہیں تو کوئی رنگ تو آپ کو ضرور متوجہ کرتا۔" وہ اُن کی باتوں سے اپنے آپ میں بڑا عجیب سا محسوس کرنے لگی تو اُٹھ کھڑی ہوئی۔

"میں چلوں۔" بس اسی قدر کہا اور کرسی پیچھے دھکیل کر دروازے کی طرف بڑھ گئی۔

"زینب شاہ۔" انہوں نے پکار لیا تو وہ وہیں رُک کر بس ذرا سا پلٹ کر دیکھنے لگی۔

"دل راکھ کا ڈھیر ہو جائے تب بھی اندر کہیں کوئی چنگاری دہکتی رہ جاتی ہے۔ بس ذرا سی ہوا کی ضرورت ہوتی ہے، اس کے بعد شعلہ بننے میں دیر نہیں لگتی۔ اگر اجازت ہو تو میں....." وہ اُن کی بات پوری ہونے سے پہلے باہر نکل گئی۔

"زینب شاہ! اب عمر بھر تمہیں یونہی راکھ ہونا ہے اور کوئی نہیں آئے گا اس راکھ میں چنگاریاں کریدنے۔" کبھی اس نے خود سے کہا تھا اور اس رات اس نے بس ذرا سا اپنے اندر جھانکا تھا۔ ڈاکٹر یزدانی کی باتوں نے دبی ہوئی چنگاریوں کو یوں ہوا دے دی تھی کہ تن من دھیمی دھیمی آنچ میں سلگنے لگا تھا۔

"کیا ایسا ممکن ہے۔" وہ بار بار سوچتی رہی اور ہر بار اُس کی نظریں ثانیہ کا طواف کرنے لگتی تھیں۔

پھر کتنے بہت سارے دن گزر گئے۔ اس دن کے بعد سے وہ ڈاکٹر یزدانی سے کترانے لگی تھی۔ دُور سے انہیں دیکھ لیتی تو غیر محسوس طریقے سے راستہ بدل جاتی انہوں نے بھی کوئی پیش رفت نہیں کی۔ غالباً اُسے چھیڑ کر مطمئن تو ہو گئے تھے۔ انہی دنوں عابدہ کی شادی تھی اور وہ اسی بہانے چھٹیاں لے کر گھر بیٹھ گئی۔ اصل میں وہ بہت اُلجھ کر رہ گئی تھی۔ جہاں ڈاکٹر یزدانی کی حقائق پر مبنی باتوں نے اُسے ڈسٹرب کیا تھا وہاں اُن کی شخصیت کا سحر بھی اُسے الجھا رہا تھا۔ وہ جتنا اُن کے خیال سے دامن بچاتی اُتنا وہ حاوی ہو رہے تھے۔

"میں کیا کروں؟" کسی کسی وقت تو وہ اتنی بے بس ہو جاتی کہ رونے لگتی تھی۔

"مما! آپ کیوں رو رہی ہیں۔" ثانیہ نے اس کا چہرا اپنے ننھے منے ہاتھوں میں لے لیا۔

"میں رو نہیں رہی بیٹا۔" اس نے اپنی آنکھیں رگڑ ڈالیں۔

"آپ کو پاپا یاد آ رہے ہیں۔"

"کیا تمہیں پاپا یاد آتے ہیں؟"

"ہاں۔" ننھی بچی کی آنکھیں چمکنے لگیں تو اس نے اُسے بازوؤں میں بھر لیا پھر اس کا دھیان بٹانے کی غرض سے بولی۔

"چلو نیچے چلتے ہیں، آج تمہاری عابدہ آنٹی دلہن بنیں گی۔"

"مما آپ کب دُلہن بنیں گی؟" وہ اس کی بات سنی اَن سنی کرتے ہوئے اسی طرح اسے گود میں لیے ہوئے نیچے آ گئی۔

پھر شام میں جب وہ سب گھر والوں کے ساتھ شادی ہال میں گئی تو دانستہ عابدہ کے پاس سٹلنگ روم میں بیٹھی ہوئی تھی۔ ویسے بھی باقی لوگوں کے لیے تو وہ اجنبی ہی تھی اور گھر تو تھا نہیں [illegible] کسی کام کے لیے اس کی ضرورت پڑ سکتی ہے۔ اس لیے اطمینان سے

بیٹھی رہی۔ جب بارات کی آمد کا شور ہوا تب بھی وہ نہیں گئی۔ البتہ جب نکاح کے لیے لوگ اندر آنے لگے تب وہ خاموشی سے ثانیہ کا ہاتھ پکڑ کر اُس چھوٹے سے روم سے باہر نکل آئی۔

"مریم آنٹی۔" ثانیہ کو پتا نہیں کہاں مریم نظر آ گئی تھی کہ اس کا ہاتھ چھڑا کر بھاگ گئی۔ وہ اس کے تعاقب میں نظریں دوڑانے لگی۔ اور جب دیکھ لیا کہ وہ مریم کے پاس پہنچ گئی ہے تب خالی جگہ دیکھ کر وہیں بیٹھ گئی۔ اس وقت آنٹی اس کے پاس آ کر عجلت میں بولیں۔

"زینب، نیچے گاڑی میں میرا بیگ رہ گیا ہے وہ لے آؤ۔ پتا نہیں مریم کہاں ہے ورنہ میں اُس سے کہتی۔"

"میں لے آتی ہوں۔" وہ اُٹھ کھڑی ہوئی۔ پھر پہلے ریلنگ کے پاس کھڑے ہو کر اس نے گاڑیوں کی قطار میں انکل کی گاڑی تلاش کی اس کے بعد سیڑھیاں اترنے لگی۔ ابھی آدھی سیڑھیاں اُتری تھی کہ اس کی گردن میں ہلکا سا جھٹکا لگا۔ پلٹ کر دیکھا تو اس کا بڑا سا دوپٹہ نیچے جھول رہا تھا اور انجانے میں اس کے پیچھے اترتے شخص نے اس پر پاؤں رکھ دیا تھا اور اب جھک کر دوپٹا اُتار رہا تھا۔

"مس آپ کا دوپٹا۔" وہ سیدھا کھڑے ہوتے ہوئے بولا تو لمحہ بھر کو دونوں ہی اپنی جگہ ٹھٹک کر رہ گئے۔

"میں تو نشے میں تھا لیکن تم تو ہوش میں تھیں۔" اس کے اطراف در و دیوار تک جیسے چیخنے لگے تھے اور زینب شاہ جو ہمیشہ یہ سوچتی تھی کہ شاید وہ کبھی علی مراد کا سامنا نہیں کر سکے گی کہ کہیں یہی بات اس کے منہ پر نہ کہہ دے تو اب وہ بس لمحہ بھر کو خوفزدہ ہوئی اور اس کے چہرے سے پھسلتی ہوئی نظریں جب اس کے ہاتھوں، پر ٹھہریں جن میں اس کے آنچل کا کونا تھامے کھڑا تھا تو آپ ہی آپ جہاں زینب شاہ کا سر اونچا ہوا وہاں وہ سٹپٹا کر اپنے ہاتھوں کو دیکھنے لگا تھا۔

"تم مجھے دے ہی کیا سکتے ہو۔ زیادہ سے زیادہ اتنا کر سکتے ہو کہ زمین پر جھولتا میرا آنچل تھام لو۔" اب کے در و دیوار علی مراد پر ہنسنے لگے تھے۔ اور گو کہ وہ قد میں اس سے کافی

اونچا تھا پھر بھی غیر ارادی طور پر ایک سیڑھی اور اوپر ہو گیا۔ اور اس کی غیر اختیاری حرکت پر وہ بے ساختہ مسکرائی۔

''اس آنچل سے میرے سر پر سائبان تانا تمہارے بس سے باہر ہے۔ خواہ تم مجھ سے کتنی ہی سیڑھیاں اوپر کھڑے ہو جاؤ۔'' بے نیازی سے کہہ کر زینب شاہ نے ہلکے سے جھٹکے سے اس کے ہاتھوں سے اپنا آنچل چھڑایا اور جیسے ہی پلٹی، وہ ایک دم ہوش میں آ گیا۔ یہی مرد کی فطرت ہے۔ خود جتنی بھی عورت کی تذلیل کر لے لیکن اپنی توہین ہرگز برداشت نہیں کرتا۔ وہ اب نوعمر لڑکا نہیں تھا۔ ستائیس اٹھائیس سال کا میچور مرد تھا۔ اس نے ایک جیت میں درمیانی ساری سیڑھیاں پھلانگ کر اس کے بازو کو گرفت میں لے لیا۔

''کیا سمجھتی ہو تم اپنے آپ کو۔''

''میرا بازو چھوڑ۔'' وہ آواز دبا کر سختی سے بولی۔ ''یہ گھر نہیں ہے۔ لوگوں کے سامنے تماشا بننے کا شوق ہے تو اس کے لیے کوئی اور راستہ اختیار کرو۔''

''مجھے تماشا بننے کا شوق نہیں ہے لیکن تمہیں ضرور تماشا بناؤں گا۔'' وہ ایک جھٹکے سے اس کا بازو چھوڑتے ہوئے بولا۔

''تم اور کر ہی کیا سکتے ہو۔'' وہ تاسف سے کہہ کر جانے لگی پھر اچانک خیال آیا تو پلٹ کر بولی۔

''سنو، مریم نہیں جانتی کہ تم نے اپنی جس جاہل اور گنوار بیوی کا ذکر کیا ہے، وہ میں ہوں اور تم اسے بتانا بھی مت ورنہ۔''

''تم۔'' اس کے منہ سے مریم کا نام سن کر وہ حیرت میں مبتلا ہو کر بس اسی قدر کہہ سکا تھا کہ وہ تیزی سے سیڑھیاں اترتی چلی گئی۔ پھر جب گاڑی میں سے آنٹی کا بیگ لے کر واپس آئی تو وہ ریلنگ کے پاس مریم کے ساتھ کھڑا تھا۔ مریم کی گود میں ثانیہ بھی تھی۔ وہ پہلے خاموشی سے نکل جانا چاہتی تھی پھر کچھ سوچ کر مریم کے پاس آ گئی اور اس کی گود سے ثانیہ کو لیتے ہوئے بولی۔

''یہ ثانیہ تمہیں بہت تنگ کرنے لگی ہے۔'' پھر ایک نظر علی مراد پر ڈال کر سوالیہ نظروں سے مریم کو دیکھنے لگی تو وہ قدرے جھینپ کر بولی۔

''میں نے اُس روز آپ سے ذکر کیا تھا ناں، یہ ڈاکٹر علی ہیں۔''

''اچھا ہاں۔'' اس نے یاد آنے کی ایکٹنگ کی پھر اس سے بولی۔

''آپ سے مل کر خوشی ہوئی ڈاکٹر علی۔''

''شکریہ۔'' وہ حتی الامکان لہجے کو نارمل رکھ کر بولا اور اس کے بجائے ثانیہ کو دیکھنے لگا تو اُسے کہنا پڑا۔

''یہ میری بیٹی ہے ثانیہ۔'' وہ کچھ نہیں بولا۔ بلکہ ذرا سی گردن موڑ کر نیچے روڈ پر بھاگتی دوڑتی گاڑیوں کو دیکھنے لگا تو وہ بھی ان کے پاس سے ہٹ آئی۔ گو کہ علی مراد کا رویہ خلاف توقع نہیں تھا۔ پھر بھی اُسے رنجیدہ کر گیا تھا کہ بقیہ سارا وقت وہ ثانیہ کو لے کر ایک کونے میں بیٹھی رہی تھی۔

☆☆☆

غالباً عابدہ کی شادی میں علی مراد نے مریم کے والدین سے مراسم بڑھا لیے تھے کہ اب وہ اکیلا اُن کے گھر بھی آنے لگا تھا۔ ہر دوسرے دن اس کی گاڑی گیٹ پر کھڑی نظر آتی۔ ایسے میں وہ ثانیہ کو اپنے ساتھ مصروف کر لیتی تا کہ وہ مریم کے پاس جانے کی بات نہ کرے۔ اور اگر ثانیہ پہلے سے نیچے ہوتی تو جب تک علی مراد اُن کے گھر موجود رہتا وہ بہت بے چینی سے ٹہلتی رہتی تھی۔ اُسے غالباً یہ خدشہ تھا کہ کہیں کسی دن علی مراد ثانیہ کو لے نہ جائے۔ گو کہ اس نے بچی سے لگاوٹ کا اظہار نہیں کیا تھا۔ پھر بھی اس کا خیال تھا وہ محض اُسے تنگ کرنے کی غرض سے بھی ایسا کر سکتا ہے۔ جس روز ثانیہ نیچے علی مراد سے مل کر آتی۔ وہ بہانے بہانے سے اس سے پوچھتی۔

''انکل نے تم سے کیا بات کی۔'' اور ہر بار ثانیہ کا ایک ہی جواب ہوتا۔

''انکل بات نہیں کرتے۔'' اُسے جہاں اطمینان ہوتا وہاں علی مراد کی سنگ دلی پر

افسوس بھی ہوتا کہ کیسا بات ہے بچی کو سامنے دیکھ کر بھی منہ موڑ لیتا ہے۔

پھر ایک دن آنٹی نے اُسے بتایا کہ ڈاکٹر علی مریم سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ پھر اُس کے بارے میں جو کچھ مریم نے اُسے بتایا تھا وہی سب باتیں آنٹی ایسے بتا کر اُس سے مشورہ لینے لگیں کہ انہیں کیا کرنا چاہیے۔ وہ سہولت سے دامن بچانا چاہتی تھی لیکن جس طرح آنٹی اُسے اپنا سمجھ کر بات کر رہی تھیں اس سے وہ دامن نہیں بچا سکی۔ پہلے یہی کہا جیسا آپ مناسب سمجھیں لیکن پھر سوچتے ہوئے بولی۔

''اُس کی پہلی بیوی خواہ کیسی بھی ہے آپ کو اُسے نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔ کیونکہ مرد کا کوئی بھروسا نہیں۔ کیا پتا کب دل میں کیا سما جائے اور وہ پہلی کی طرف لوٹ جائے۔''

''یہ تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔'' آنٹی پر سوچ انداز میں سر ہلانے لگیں۔

''اس لیے آپ پہلے ہی صاف کر لیں۔ اگر وہ اُسے نہیں رکھنا چاہتا تو چھوڑ دے۔ یہ اس لڑکی کے لیے بھی بہتر ہوگا۔ وہ نئی زندگی شروع کر سکے گی ورنہ ساری زندگی اس کے نام پر بیٹھ کر اُسے کیا ملے گا۔''

''میں نے یہ بات کہی تھی اس سے۔'' آنٹی نے کہا تو وہ پوری طرح اُن کی طرف متوجہ ہوگئی۔

''پھر کیا کہا اُس نے؟''

''کہہ رہا تھا وہ لڑکی طلاق نہیں لینا چاہتی۔ کہتی ہے بے شک دوسری شادی کر لو، میرے ساتھ کوئی رابطہ نہ رکھو لیکن طلاق مت دو۔'' پھر خود ہی کہنے لگیں۔

''تم تو جانتی ہو، گاؤں کی گنوار لڑکیاں ایسے ہی زندگی گزار دیا کرتی ہیں۔ مرد خواہ پوچھے نہ پوچھے اس کے نام پر بیٹھ..... کر سمجھتی ہیں بڑا ثواب کما لیا۔ یہ نہیں سوچتیں کہ اپنی زندگی برباد ہوئی۔''

''جی جی'' وہ بس اسی قدر کہہ سکی جبکہ اس کا ذہن کہیں اور الجھنے لگا تھا۔'' کیا فرق ہوا پھوپھی مراداں میں اور مجھ میں۔ صرف اتنا کہ وہ اب بھی اس مرد کی دست نگر ہے جو

اس پر ایک نگاہِ غلط بھی ڈالنا پسند نہیں کرتا اور میں خود اپنے پیروں پر کھڑی ہوں۔ کیا فائدہ اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کا جب اپنے حق کے لیے لڑ نہ سکوں۔''

''گاؤں کی گنوار لڑکیاں ایسے ہی زندگی گزار دیا کرتی ہیں۔'' رات میں جب وہ تنہا تھی تو اُسے آنٹی کی باتیں یاد آنے لگیں۔

''مرد خواہ پوچھے نہ پوچھے اس کے نام پر بیٹھ کر سمجھتی ہیں بڑا ثواب کما لیا۔ یہ نہیں سوچتیں کہ اپنی زندگی برباد ہوئی۔''

''لیکن میں اپنی زندگی برباد نہیں کروں گی۔'' اُس کے اندر جوار بھاٹا اُٹھنے لگا۔'' علی مراد کو یہ خوش فہمی۔ کیوں ہے کہ میں اس کے نام پر بیٹھی رہوں گی یا وہ قصداً مجھے اپنا پابند رکھنا چاہتا ہے۔

سراسر خود غرضی و خود پسندی۔ کہ شاہراہ حیات پر چلنے کے لیے خود تو اپنے لیے نیا ساتھی منتخب کر لیا اور میرے لیے چاہتا ہے کہ ہمیشہ تنہا چلتی رہوں۔

''مجھے تنہا ہی چلنا تھا علی مراد۔'' وہ دل ہی دل میں اُسے مخاطب کر کے بولی۔

''لیکن تمہاری سوچ کی پستی مجھے نئے راستے دکھا رہی ہے جنہیں اگر میں نے خود پر بند کر لیا تو برادری میں ہر دور میں تمہارے جیسے مرد پیدا ہوتے رہیں گے اور دوسری صورت میں بیٹیوں کے بارے میں کوئی بھی فیصلہ کرنے سے پہلے لوگ کم از کم..... زینب شاہ کو ضرور سوچیں گے۔ اور زینب شاہ اپنی برادری کی لڑکیوں کے لیے مثال بنے گی۔ انہیں یہ پکی دے گی کہ زندگی پر اُن کا بھی اتنا ہی حق ہے جتنا کہ اُن کے مردوں کا۔''

اُس نے فیصلہ کُن انداز میں سوچا تھا اور اگلے ہی دن علی مراد کے آفس چلی گئی۔

''زینب شاہ۔'' اُسے دیکھ کر وہ کرسی چھوڑ کر کھڑا ہو گیا اور سامنے بیٹھنے کا اشارا کرتے ہوئے بولا۔

''میں خود بھی تم سے ملنا چاہتا تھا۔''

''کس سلسلے میں؟'' اُسے کچھ کچھ اندازہ تو تھا پھر بھی یکسر انجان بن گئی اور بے حد

سرسری انداز میں پوچھا

''یہ بھی بتادوں گا، پہلے تم بتاؤ چائے پیو گی یا بلکہ یہ بتاؤ یہیں بیٹھ کر بات کریں یا کہیں اور چلیں۔'' وہ انٹرکام پر ہاتھ رکھ کر سوالیہ نظروں سے اُسے دیکھنے لگا۔

''اگر یہاں کوئی حرج نہیں ہے تو یہیں ٹھیک ہے۔''

''او کے۔'' اس نے انٹرکام پر چائے کے لیے کہا۔ پھر بیٹھا تو اُسے نظروں کی گرفت میں لیتے ہوا بولا۔

''ہاں اب بتاؤں کیسے آنا ہوا؟'' وہ فوراً کچھ نہیں بولی بلکہ پہلے کچھ باتوں کو ذہن میں ترتیب دیا پھر کہنے لگی۔

''دیکھو علی مراد، تم نے تو مریم اور اس کے گھر والوں کو جو کہانی سنائی یا حقیقت کہہ لو۔ مجھے بہر حال اس سے کوئی غرض نہیں۔ میں تمہاری صرف ایک بات کی تمہارے سامنے تردید کرنا چاہتی ہوں کہ مجھے تمہارے نام پر بیٹھے رہنے کا کوئی شوق نہیں۔''

''گویا طلاق چاہتی ہو۔'' پھر وہی ضد والی بات کہ ''تم اگر چاہو تو میں تمہیں طلاق دے سکتا ہوں۔'' اور وہ اس کے لیے پہلے بھی تیار تھی فوراً بولی۔

''میں تمہاری منت کرنے نہیں آئی علی مراد۔ محض تمہیں بتانے آئی ہوں۔ تم طلاق دینا چاہو تو دے دو بات سہولت سے ختم ہو جائے گی ورنہ مجھے تم سے علیحدگی کا دوسرا راستہ بھی معلوم ہے۔''

''میں جانتا ہوں تم بہت سے راستوں سے آشنائی حاصل کر چکی ہو۔'' وہی ایک عام سے روایتی مرد والا شبہات سے پر لہجہ اور انداز جس پہ وہ اندر ہی اندر تلملانے کے باوجود بڑے ضبط کا مظاہرہ کر گئی۔

''نہیں تم کچھ بھی نہیں جانتے۔''

''اچھا۔'' وہ خوامخواہ ہنسا پھر اُسے سنجیدہ دیکھ کر فوراً ہنسی روک لی اور خود بھی سنجیدہ ہوتے ہوئے بولا۔

''میں بھی تم سے اسی سلسلے میں ملنا چاہتا تھا۔ اپنی برادری کے رسم و رواج اور فرسودہ قسم کی روایات تم بھی جانتی ہو اور میں بھی۔ اور میں ان روایات سے بغاوت کر کے اس لیے نہیں نکلا تھا کہ صرف اپنی زندگی بنالوں۔ مجھے تمہارا بھی خیال رہا اور میں چاہتا تھا کہ تم خود اپنے بارے میں سوچو۔ گاؤں کی دوسری لڑکیوں کی طرح ایک آس پر مت بیٹھی رہو۔'' اور زینب شاہ کا پورا وجود اچانک گہری خاموشیوں کے حصار میں مقید ہو گیا۔ ایک ٹک اُسے دیکھے گئی جو کہہ رہا تھا۔

''میں اکثر سوچا کرتا تھا کہ اکثر لڑکیوں کی شکلیں ایک جیسی کیوں لگتی ہیں۔ چہروں پر یاس و حسرت، آنکھوں میں وحشت اور آہٹوں پر چونکنے کے بجائے دہلتی ہیں۔ یقیناً وہ سب اس بات سے خوفزدہ تھیں کہ کہیں اُن کی قسمتوں کا فیصلہ عمر میں اُن سے کئی گنا چھوٹے لڑکوں کے ساتھ نہ کر دیا جائے۔'' اُس نے ایک گہری سانس لے کر ہونٹ بھینچ لیے اور کچھ دیر سوچنے کے بعد کہنے لگا۔

''مجھے آج بھی تمہارا ان وہ روپ یاد ہے زینب شاہ۔ جو دوسری لڑکیوں سے قدرے مختلف نظر آتا تھا۔ چولہے کے پاس بیٹھ کر جب تم تھوڑی گھٹنوں پر ٹکا لیتیں۔ پھر راکھ میں سے چنگاریاں کریدتے ہوئے کبھی کبھی بس لمحہ بھر تمہاری آنکھوں میں دھنک رنگ اُترتے تھے اور اُس پل تم مجھے اتنی اچھی لگتی تھیں کہ میرا دل چاہتا تھا۔ میں اُن رنگوں کو ہمیشہ کے لیے تمہاری آنکھوں میں امر کر دوں۔ لیکن پھر ایسا ہوا کہ میرا تمہارا نکاح ہو گیا اس کے بعد تمہاری آنکھوں میں ایسی وحشتیں سمائیں کہ میں تم سے ڈرنے لگا اور میں تم تمہیں بتاؤں زینب شاہ۔ کہ میں نے گاؤں اس لیے نہیں چھوڑا تھا کہ میں اس وقت باغی ہو گیا تھا۔ نہیں، اُس وقت تو مجھے اتنی سمجھ بھی نہیں تھی بلکہ اس لیے کہ تمہاری شکل دوسری لڑکیوں کی طرح ہو گئی تھی اور کچھ کچھ پھوپھی مراداں سے بھی ملنے لگی تھی۔ پھر بہت سارا وقت گزرنے کے بعد جہاں مجھ پر اور بہت ساری باتوں کا ادراک ہوا وہاں میں نے یہ بھی جانا کہ سب شکلیں ایک جیسی کیوں لگتی ہیں اور اُسی وقت میں نے سوچ لیا تھا کہ اگر میرے اختیار میں زیادہ نہیں ہے

تب بھی اتنا تو رہے کہ میں صرف ایک شکل کو ہی اس کا اصل روپ دے دوں۔ تمہاری آنکھوں سے وحشتوں کی دھند صاف کر کے انہی رنگوں کی برسات بخش دوں جو تمہیں سب سے الگ کرتی تھی۔

انہی دنوں میں بی اے کر گاؤں گیا تھا اور تمہیں اتنا پر اعتماد دیکھ کر اور یہ جان کر تم نے انٹر کر لیا ہے۔ میں بتا نہیں سکتا کہ میں کتنا خوش ہوا تھا اور اُسی وقت میں تمہارے ساتھ اطمینان سے بیٹھ کر یہ بات کرنا چاہتا تھا جو تم آج کر رہی ہو۔ لیکن حالات کچھ ایسے ہو گئے کہ میں وہاں سے چلا آیا۔" قدرے توقف کے بعد کہنے لگا۔

"اس کے بعد میں نے تمہیں لکھا کہ اگر تم چاہو تو میں تمہیں طلاق دے سکتا ہوں اور تم نے میری اس بات کو غلط انداز سے سوچا۔ تم غالباً یہ سمجھی تھیں کہ میں اپنا دامن بچانا چاہتا ہوں۔ نہیں زینب شاہ ایسی بات نہیں تھی بلکہ میں تو تمہیں پہلا قطرہ بنانا چاہتا تھا کہ تم اتنی پر اعتماد اور مضبوط ہو جاؤ کہ اپنے حق کے لیے آواز اٹھاؤ۔ جسے برادری کے سب لوگ سن یں۔ خاص کر وہ لڑکیاں جن کی آنکھوں میں سپنوں کے وحشتیں اُتری ہیں تا کہ آئندہ کبھی ان کے ساتھ ایسا ہو تو تمہاری دیکھا دیکھی وہ بھی آواز اٹھائیں لیکن تم....." وہ خاموش ہو کر آہستہ آہستہ نفی میں سر ہلانے لگا۔ پھر طویل سانس لے کر اُس کی طرف دیکھا تو وہ جو متحیر سی اس پر نظریں جمائے بیٹھی تھی کچھ نروس ہو کر سر جھکا گیا۔

"اب بتاؤ کیا چاہتی ہو؟" وہ ہلکی سی مسکراہٹ ہونٹوں تک آنے سے نہیں روک سکا۔

"تم اچھی طرح جانتے ہو۔" وہ بمشکل بول سکی۔

"اپنے منہ سے نہیں کہو گی۔"

"یہاں کون سے برادری والے بیٹھے ہیں جو میری آواز سنیں گے۔"

"میں جو ہوں اور بڑی شدید خواہش رکھتا ہوں کہ میری برادری کی کوئی لڑکی اپنے لیے آواز اٹھائے۔ اگر یہاں کوئی نہیں ہے۔ تب بھی میرے توسط سے تمہاری آواز سب تک پہنچ جائے گی۔" اُس نے کتنی دیر سے سینے میں دبی سانس کو ہونٹوں کی قید سے آزاد کیا

پھر اٹھتے ہی بولی۔

"میں اب چلوں۔ ثانیہ اسکول سے آ چکی ہو گی۔" اور علی مراد نے خاصا مایوسی ہو کر کرسی کی بیک سے سر ٹکا لیا اور اُسے جاتے ہوئے دیکھنے لگا۔ دروازے کے قریب وہ رکی پھر پلٹ کر کہنے لگی۔

"سنو علی مراد، جب یہ طے ہے کہ ہمیں ایک دوسرے کے ساتھ نہیں رہنا اور یہ بھی کہ میں تمہارے نام پر بیٹھی نہیں رہنا چاہتی۔ اس لیے میرا خیال ہے تم مریم سے شادی کرنے سے پہلے مجھے طلاق دے دو۔"

"زینب۔" وہ پتا نہیں کیوں اپنی جگہ سے اُٹھا اور کچھ کہنے کے لیے غالباً الفاظ ڈھونڈ رہا تھا کہ وہ باہر نکل آئی۔ اور آفس کے سامنے اسٹاپ پر کھڑی ہونے کے بجائے وہ یونہی چلتی چلی گئی۔ علی مراد نے اسے پہلا قطرہ بنا تو دیا تھا لیکن اب اُسے یوں لگ رہا تھا۔ جیسے پوری برادری ہاتھوں میں سنگ لیے اور اس کے پیچھے پیچھے چلی آ رہی ہو۔ اس نے قدموں کی رفتار اور تیز کر دی۔ موڑ کاٹتے ہوئے اگر دوسری طرف سے آتی گاڑی نے بروقت بریک نہ لگائے ہوتے تو وہ روڈ پر پڑی ہوتی۔

"زینب شاہ۔" وہ اپنے حواس درست کرنے میں لگی ہوئی تھی۔ دیکھا ہی نہیں ڈاکٹر یزدانی گاڑی سے نکل کر اس کے پاس آ گئے۔

"آپ ٹھیک تو ہیں۔" وہ پریشانی سے پوچھ رہے تھے۔ تب وہ چونک کر انہیں دیکھنے لگی۔

"آیئے گاڑی میں بیٹھیں۔" انہوں نے کہا تو وہ خاموشی سے اُن کے ساتھ بیٹھ گئی۔

"کہاں جانا ہے؟" وہ احتیاط سے گاڑی بیک کرتے ہوئے پوچھنے لگے۔

"گھر۔"

"گھر۔" انہوں نے دہرایا پھر اس کے گھر کا پتہ پوچھنا چاہتے تھے۔ معاً مرر۔ میں اس پر نظر پڑی تو خاموش ہو رہے۔ کیونکہ وہ بہت اَپ سیٹ لگ رہی تھی۔ کچھ دیر

تک خاموشی سے ڈرائیو کرتے رہے پھر کہنے لگے۔

''آپ کچھ پریشان ہیں۔سب ٹھیک تو ہے ناں؟

''جی!''

''پھر کیا بات ہے؟''

''کوئی خاص بات نہیں۔''

''اچھا۔'' وہ ہلکے سے ہنسے۔

''شاید آپ کو یاد ہو، ایک بار میں نے کہا تھا کہ آپ واحد خاتون ہیں جو جھوٹ بولتے ہوئے بھی اچھی لگتی ہیں۔''

''اس وقت میں نے کیا جھوٹ بولا ہے۔''

''یہی کہ کوئی خاص بات نہیں جبکہ میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ ابھی کچھ دیر پہلے آپ کے ساتھ جو بھی بات ہوگئی ہے۔وہ آپ کے لیے اتنی اہم ہے کہ آپ ابھی تک اُسی کے زیر اثر ہیں۔اور آپ کو یہ بھی سمجھ میں نہیں آرہا کہ روئیں یا ہنسیں۔''

''ڈاکٹر یزدانی!'' اس نے بے حد حیران ہو کر انہیں دیکھا تو وہ مرر میں اُس پر نظر ڈال کر بولے۔

''کبھی کبھی ایسا ہو جاتا ہے زینب شاہ۔متضاد کیفیات انسان کو پریشان..... کر دیتی ہیں۔میری مانیں تو پہلے خوب جی بھر کر رو لیں۔مدتوں سے جو آپ کے گرد اداسیوں اور مایوسیوں کے بادل چھائے ہیں۔رونے سے جہاں وہ چھٹیں گئے وہاں دل کے دریچوں پر لگے قفل بھی ٹوٹ جائیں گے۔'' قدرے توقف کے بعد بولے۔

''رونے کے لیے اگر کندھے پر سر رکھنا ضروری ہو تو میں اپنا کندھا مستعار دے سکتا ہوں۔لیکن اس شرط پر کہ آج کے بعد پھر کبھی نہیں رونا۔'' اور وہ اُن کے کندھے پر تو نہیں ہاتھوں میں چہرا چھپا کر رو پڑی۔انہوں نے ذرا سی گردن موڑ کر اسے دیکھا اور ایک افسردہ سی مسکراہٹ اُن کے لبوں پر آن ٹھہری تھی۔

''بس کرو زینب شاہ۔'' کتنی دیر بعد جب وہ کسی طرح چپ نہیں ہوئی تب وہ بڑی منت سے بولے۔

''اس طرح مت روؤ مجھے بہت دکھ ہو رہا ہے۔بخدا میں نے کبھی تمہیں روتے ہوئے دیکھنے کا تصور بھی نہیں کیا۔'' اس نے بہت آہستگی سے چہرے سے ہاتھ ہٹائے پھر چادر کے پلو سے آنکھیں اور چہرا صاف کرنے لگی۔

''اب کیا محسوس کر رہی ہیں؟'' کچھ دیر بعد انہوں نے پوچھا۔

''قدرے بہتر۔'' اس کی آواز میں آنسوؤں کی آمیزش تھی۔'' لیکن آپ کیسے جانتے تھے کہ میں رونا بھی چاہتی ہوں اور ہنسنا بھی۔''

''میں نے آپ کو بتایا تو تھا کہ برسوں پہلے میں نے ذہن کے کینوس پر ایک تصویر بنائی تھی پھر اُسے اپنی مرضی اور پسند کے رنگوں سے سجایا تھا تو کیا اپنے ہی رنگوں کو میں نہیں پہچانوں گا۔'' کچھ دیر رُک کر بولے۔

''میں جانتا ہوں کہ آپ اُسی روز جان گئی تھیں پھر بھی اس وقت اگر میں اعتراف کر لوں تو کیا بُرا ہے۔میرے جذبوں میں کہیں کھوٹ نہیں تھی زینب شاہ جبھی تو آپ حقیقت بن کر میرے سامنے آگئیں۔یقین کریں میرے پاس آپ کے لیے بہت کچھ ہے۔میں نے اپنی زندگی کے سارے سکھ، ساری چھوٹی بڑی خوشیاں سنبھال رکھی ہیں۔محبتوں کی حسین رہگزر پر چلتے ہوئے جب آپ میرے گھر تک آئیں گی تو احسن یزدانی اپنی قسمت پر نازاں و شاکر ہو کر وہ سارے سکھ، وہ ساری خوشیاں آپکے قدموں میں نچھاور کر دے گا۔''

''لیکن میں تنہا نہیں ہوں یزدانی۔میرے ساتھ ثانیہ بھی ہے۔''

''میں جانتا ہوں۔'' وہ اطمینان سے بولے۔

''میری محبتوں کا سائبان بہت وسیع ہے زینب، جس میں تمہاری ذات سے وابستہ ہر شے سما سکتی ہے اور پھر ثانیہ تو تمہاری ذات ہی کا ایک حصہ ہے۔''

''اس طرف موڑ دیں۔'' وہ راستے کی نشاندہی کر کے شیشے سے باہر دیکھنے لگی۔اصل

میں اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا اب کیا کہے۔ اُن کی بات پر دل اگر یقین کر بھی رہا تھا تو بھی کچھ اندیشے ساتھ لگے ہوئے تھے۔ گھر کے سامنے گاڑی رُکوا کر کچھ کہنے بغیر اترنے لگی تو وہ اسے روک کر بولے۔

''سنو۔ میں تمہیں مجبور نہیں کروں گا۔ فیصلے کا اختیار تمہیں ہے اور جو بھی فیصلہ کرنا اپنا اور بچی کا مفاد سوچ کر کرنا۔ لیکن پلیز کسی بھی مقام پر میری محبت پر شبہ مت کرنا کہ ایک یہی بات مجھے مار ڈالے گی۔'' اس نے لحہ بھر کو اُن کے چہرے کی طرف دیکھا پھر اسی خاموشی سے اتر گئی۔

کتنے بہت سارے دن گزر گئے۔ پہلے کئی دن تک تو وہ الجھی ہوئی سی رہی۔ کچھ سوچا ہی نہیں گیا۔ پھر جب اپنے آپ کو حالات کو سمجھنے اور سوچنے پر آمادہ کیا تو اُسے ڈاکٹر یزدانی کے پروپوزل میں کوئی بُرائی نظر نہیں آئی۔ کیونکہ اس کے پیشِ نظر اپنے آپ سے زیادہ ثانیہ کی ذات تھی اور ظاہر ہے جب یزدانی، ثانیہ کو محبت کے ساتھ قبول کر رہے تھے تو پھر اُسے اور کیا چاہیے تھا جبکہ اُس کے لیے بھی بقول یزدانی کے اُن کے پاس بہت کچھ تھا۔ پھر یہ تو فطری سی بات ہے کہ جب ہر طرف سے طمانیت کا احساس مل جائے تو پھر اپنی ذات سے غفلت بھی نہیں رہتی۔ اور زینب شاہ ابھی اتنی بوڑھی بھی نہیں ہوئی تھی کہ دل کے دروازوں پر کوئی محبت سے دستک دیتا رہے اور وہ مسلسل اپنے کان بند رکھے۔ بہت آہستگی سے اس نے دل کے سارے کواڑ کھول دیے اور آنکھوں کے بھی جن میں دھنک رنگ برسات اترنے کو بے تاب تھی۔

اُن دنوں وہ اپنے آپ پر کچھ زیادہ توجہ دینے لگی تھی اور اُسے خود معلوم نہیں تھا کہ وہ بات بے بات کھلکھلا کر ہنسنے لگی ہے۔ ایک دن مریم نے رازداری سے پوچھ لیا۔

''سچ بتائیں۔ زینب باجی! کیا پالیا ہے؟''

''کیا.....؟'' وہ کچھ نہ سمجھتے ہوئے سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی۔

''کہیں علی مراد نے کوئی سندیسہ تو نہیں بھیجا۔''

''علی مراد نے!'' وہ جیسے خوابوں سے چونکی تھی۔ نظریں مریم اور ذہن کہیں اور بھٹکنے لگا تھا۔ اُس روز کے بعد سے پھر علی مراد سے ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ حالانکہ اُس نے کہا تھا کہ جلد ہی علیحدگی کے سلسلے میں کارروائی کر کے اُس سے رابطہ کرے گا۔ اور ابھی تک اُس نے ایسا نہیں کیا تھا۔ اب تک تو اُسے فکر نہیں تھی لیکن ابھی جب مریم نے علی مراد کے سندیسے کی بات کی تب وہ سوچنے لگی اور اُسے اپنے آپ پر حیرت بھی ہوئی کہ وہ اس مسئلے سے اتنی لاپروا کیسے وہ گئی ہے جب کہ آئندہ زندگی کی بنیادیں بھی وہ اسی وقت تک نہ رکھ سکتی تھی جب تک وہ مسئلہ حل نہ ہو جاتا۔

''کیا میں نے آپ کو ہرٹ کیا ہے۔'' مریم اُسے سوچوں میں گم دیکھ کر نادم ہو کر بولی تو وہ ایک بار پھر چونکی اور سر جھٹکتے ہوئے بولی۔

''نہیں۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔''

''پھر آپ کیا سوچنے لگی تھیں؟''

''کچھ نہیں۔'' وہ ہلکے سے مسکرائی۔

''نہیں زینب باجی! کوئی بات ضرور ہے جو آپ چھپا رہی ہیں۔'' مریم یقین سے بولی۔ پھر اصرار کرنے لگی۔ ''بتائیے ناں۔ آخر مجھ سے بھی تو جب آپ نے ڈاکٹر علی کے بارے..... میں پوچھا تھا تو میں نے صاف صاف بتا دیا تھا آپ بھی بتائیں۔''

''کیا بتاؤں۔'' وہ یونہی ہنس پڑی۔

''آپ کے بدلے بدلے انداز اس بات کے غماز ہیں کہ آپ کی زندگی میں کوئی آ چکا ہے۔'' مریم کی آنکھوں میں معنی خیزی اور ہونٹوں پر شریر مسکراہٹ نے اُسے بے ساختہ ہنسنے پر مجبور کر دیا۔

''تم تو اچھی خاصی سمجھدار ہو گئی ہو مریم! اور یہ یقیناً ڈاکٹر علی کی محبت کا اثر ہے۔''

''آپ میری بات چھوڑیں۔ اپنی سنائیں کہ آپ کے ہونٹوں نے بات بے بات مسکرانے کے ڈھنگ کہاں سے سیکھے ہیں۔''

مریم غالباً جاننے کا تہہ کر چکی تھی، اس لیے اس وقت تک اس کے پیچھے پڑی رہی جب تک اس نے ہتھیار نہیں ڈال دیے۔

''ڈاکٹر احسن یزدانی، وہیں یونیورسٹی میں پڑھاتے ہیں۔'' اُس نے بتایا پھر کہنے لگی۔

''پہلے میں نے اس انداز سے کبھی نہیں سوچا تھا۔ میرا خیال تھا کہ اب جب کہ میں اپنے پیروں پر کھڑی ہو چکی ہوں تو بقیہ زندگی سہولت سے گزر جائے گی، لیکن پھر ڈاکٹر یزدانی نے مجھے احساس دلایا کہ میں زیادہ عرصہ تک تنہا حالات کا مقابلہ نہیں کر سکوں گی۔''

''کیا انہوں نے آپ کو پروپوز کیا ہے؟''

''ہاں!''

''یہ تو اچھی بات ہے۔ آپ جلدی سے علی مراد سے چھٹکارا حاصل کر لیں۔''

جس انداز سے مریم نے یہ بات کہی، وہ بغور اُسے دیکھنے لگی، اگر اس وقت وہ اسے بتا دیتی کہ علی مراد اور ڈاکٹر علی ایک ہی شخصیت ہے تو یقیناً اسے خاصا شاک لگتا۔ اور ہو سکتا ہے وہ اس سے متنفر بھی ہو جاتی اور ایسا وہ نہیں چاہتی تھی کیونکہ اس کے خیال میں علی مراد فطرتاً بُرا نہیں تھا پھر اس نے مریم سے اپنا شادی شدہ ہونا بھی نہیں چھپایا تھا جس سے ظاہر تھا کہ اسے دھوکے میں نہیں رکھنا چاہتا تھا۔ بہر حال اس وقت اس نے ایسی کوئی بات نہیں کی جس سے مریم کو کوئی شبہ ہو۔ لیکن وہ سوچ ضرور چکی تھی کہ کسی مناسب وقت میں مریم کو بتائے گی۔ اس وقت وہ خاصی سنجیدگی سے بولی۔

''میں اس سلسلے میں مراد سے ملی تھی۔''

''پھر کیا کہا اس نے؟'' مریم نے بے صبری کا مظاہرہ کیا۔

''کہتا کیا۔ وہ خود بھی یہی چاہتا تھا بس میرے منہ سے سننا چاہتا تھا۔'' قدرے توقف کے بعد کہنے لگی۔ ''مجھے اُس سے کوئی شکایت نہیں ہے مریم وہ بہت اچھا انسان ہے۔ اگر ہماری عمروں میں اتنا زیادہ فرق نہ ہوتا یا ہماری شادی اُس دور میں نہ ہوتی جب وہ بچہ اور میں بڑی تھی تو شاید ہم ایک دوسرے کو قبول کر لیتے۔ لیکن قبل از وقت شادی نے ہمارے

درمیان جو خلیج حائل کر دی اُسے پاٹنا ہمارے اختیار میں نہیں ہے۔ بہر حال اب دیکھو، وہ کب اس نام نہاد بندھن سے مجھے بھی آزاد کرتا ہے اور خود بھی آزاد ہوتا ہے۔''

''ثانیہ کے بارے میں اُس نے کوئی بات کی تھی؟'' مریم پتا نہیں کس خیال کے تحت پوچھنے لگی۔

''نہیں۔'' وہ نفی میں سر ہلانے لگی۔

''لیکن آپ ضرور بات کر لیں ایسا نہ ہو کل کلاں کو وہ ثانیہ کا دعویدار بن کر آ جائے۔'' مریم بڑی سمجھداری کی بات کر رہی تھی۔ وہ کچھ دیر تک اس کی طرف دیکھتی رہی پھر کہنے لگی۔

''ثانیہ کی طرف سے میں زیادہ فکرمند یوں نہیں ہوں مریم! کہ علی مراد سے میرا ماموں زاد والا رشتہ تو کبھی نہیں ٹوٹے گا۔ اگر ثانیہ اس کے پاس چلی بھی جائے تو یہ خدشہ تو نہیں ہوگا کہ وہ ہمیشہ کے لیے مجھ سے چھین کر لے گیا ہے۔ وہ بہر حال اس کا باپ ہے۔ کبھی نہ کبھی تو اس کے دل میں بیٹی کے لیے محبت جاگے گی تو میں سمجھتی ہوں یہ کوئی پریشانی والی بات نہیں ہے۔''

''چلیے۔ اگر آپ مطمئن ہیں تو پھر ٹھیک ہے۔ اب یہ بتائیے کہ ڈاکٹر یزدانی سے کب ملوا رہی ہیں۔''

''کیا کرو گی اُن سے مل کر؟''

''انہیں بتاؤں گی کہ آپ کتنی اچھی ہیں۔''

''تمہیں بتانے کی ضرورت نہیں ہے۔ کیونکہ اُن کا دعوا ہے کہ وہ مجھ سے زیادہ مجھے جانتے ہیں۔''

''ارے!'' مریم زور سے ہنسی تو وہ سر اونچا کر کے آسمان پر دور تک نظریں دوڑانے لگی۔

☆☆☆

وہ شدت سے علی مراد کی طرف سے کسی بات کی منتظر تھی اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اُس نے اس روز کے بعد سے خاموشی کیوں اختیار کر لی ہے۔ اس کے کہنے کے باوجود طلاق کے سلسلے میں پیش رفت کیوں نہیں کی۔

''کہیں ایسا تو نہیں کہ اس کا ارادہ بدل گیا ہو۔''

وہ پھر اندیشوں میں گھرنے لگی۔ ایک دو بار اُس کے آفس فون کیا تا کہ اس سے معلوم کر سکے لیکن وہ ملا ہی نہیں۔ تب کچھ مایوس سی ہو کر اپنا محاسبہ کرنے بیٹھی تو احساس ہوا کہ وہ نئی راہوں میں بڑی دور تک نکل گئی ہے جہاں سے واپسی کا خیال ہی سوہان روح تھا۔ ڈاکٹر یزدانی نے بڑی خوبصورتی سے اس کے احساسات کو چھو کر اپنا آپ منوایا تھا کہ اب اگر وہ کوشش بھی کرتی تو دامن نہیں جھٹک سکتی تھی اور وہ دامن جھٹکنا بھی نہیں چاہتی تھی۔

''زینب شاہ!'' اُس روز ڈاکٹر یزدانی نے اُسے روک لیا۔ ''میں نہیں جانتا تھا کہ آپ اذیت دینا بھی جانتی ہیں۔''

''میں.....!'' اس نے حیران ہو کر اپنی طرف اشارا کیا۔

''دو ماہ سے مجھے انتظار کی سولی پر لٹکا کر آپ کتنے اطمینان سے ہیں۔''

''میں اطمینان سے نہیں ہوں۔'' وہ فوراً بولی۔

''کیا کوئی پرابلم ہے؟''

''پتا نہیں۔ میرا مطلب ہے، ابھی میں کچھ نہیں کہہ سکتی۔''

''کیوں.....؟''

''کیونکہ ابھی پرانے بندھن کا طوق میرے گلے میں پڑا ہے۔''

''تو اتار پھینکیے اسے یا ڈرتی ہیں۔''

''نہیں۔ میں ڈرتی نہیں ہوں۔ بس آپ تھوڑا انتظار کریں۔'' اس کے ساتھ ہی وہ ان کے پاس سے چلی آئی تھی۔

اُسے واقعی احساس تھا کہ ڈاکٹر یزدانی کس شدت سے اس کے جواب کے منتظر ہیں۔ جبھی اس روز وہ یونیورسٹی سے نکلی تو سیدھی علی مراد کے آفس چلی گئی۔ وہاں سے معلوم ہوا۔ وہ پچھلے کئی روز سے چھٹی پر ہے۔ تب اس کی سمجھ میں نہیں آیا۔ کیا کرے۔ اس کے گھر کا پتا معلوم نہیں تھا ورنہ وہاں بھی چلی جاتی۔ مجبوراً گھر آ گئی۔ وہ خاصی دل برداشتہ ہو رہی تھی۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی بیگ اور چادر پھینک کر بیڈ پر ڈھے سی گئی۔

کچھ دیر بعد ثانیہ بھی نیچے سے آ گئی تو اس نے پہلے اس سے کھانے کا پوچھا جب اس سے بتایا کہ وہ مریم آنٹی کے ساتھ کھانا کھا کر آئی ہے۔ تب وہ اسے پہلو میں لٹا کر تھپکنے لگی اور اسے سلاتے سلاتے وہ خود بھی سو گئی تھی۔

شام میں اٹھی تو حسب معمول پہلے چولہے پر چائے کا پانی رکھا پھر ثانیہ کا منہ دھلا کر اس کے کپڑے بدلے۔ اس کے بعد خود منہ ہاتھ دھو کر کچن میں آئی۔ اور ابھی چائے دم کر رہی تھی کہ مریم آ گئی۔ اس نے دوسرا مگ بھی اتار لیا پھر دونوں میں چائے ڈال کر باہر لے آئی۔

''میں ابھی پی کر آ رہی ہوں۔'' مریم اس کے دونوں ہاتھوں میں مگ دیکھ کر کہنے لگی۔

''کوئی بات نہیں۔ اور پی لو۔'' اس نے زبردستی ایک مگ اسے تھما دیا۔ پھر کرسی کھینچ کر بیٹھی تو کہنے لگی۔

''بڑے دنوں سے عابدہ نہیں آئی۔''

''اُس کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔''

''کیا ہوا ہے؟'' وہ تشویش سے پوچھنے لگی۔

''وہی جو شادی کے بعد ہوتا ہے۔''

''اچھا!'' مریم کے شرارت سے کہنے پر وہ ہنسی پیشگی مبارک ہو۔''

''شکریہ! آپ کو بھی مبارک ہو۔'' وہ ہلکے سے سر ہلا کر چائے پینے لگی۔ پھر اچانک کچھ خیال آیا تو کہنے لگی۔

"سنو۔ بہت دنوں سے تمہارے ڈاکٹر علی بھی نظر نہیں آئے۔"

"وہ اپنے گاؤں گئے ہوئے ہیں۔" مریم نے بتایا تو وہ کتنی دیر تک اُسے دیکھتی رہی۔

"آپ اس طرح کیوں دیکھ رہی ہیں۔"

"کس سلسلے میں گئے ہیں؟" وہ اس کی بات نظر انداز کر کے پوچھنے لگی۔

"غالباً اپنے والدین کو لینے گئے ہیں تاکہ باقاعدہ یہاں پروپوزل بھیج سکیں۔"

"اچھا....." وہ اس قدر کہہ کر پتا نہیں کیا سوچنے لگی۔ پھر خیال آیا تو پوچھا۔ "اور اپنی پہلی بیوی کے بارے میں کیا فیصلہ کیا ہے انہوں نے۔"

"کہہ رہے تھے۔ اسے طلاق دے دیں گے، حالانکہ میں نے ایسی کوئی شرط نہیں رکھی۔"

"ایک بات بتاؤ مریم! وہ اچانک اُسے بتانے پر آمادہ ہوئی۔ "اگر کبھی تمہارا اس عورت سے سامنا ہو جائے تو تمہارے کیا احساسات ہوں گے۔"

"پتا نہیں باجی؟ میں نے ایسا کبھی نہیں سوچا۔"

"چلو اب فرض کر لو کہ وہ تمہارے سامنے موجود ہے۔" یہ بات کرتے ہوئے وہ بالکل غیر ارادی طور پر اپنی طرف اشارہ کر گئی تھی۔ کہ مریم غیر یقینی سے بولی۔

"آپ.....!" اُس نے فوراً اپنے سینے سے ہاتھ ہٹایا لیکن مریم جان گئی تھی اس کے گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر بولی۔

"سچ بتائیں باجی! کیا آپ ہی ہیں؟"

"ہاں میں ہوں۔" اسے اعتراف کرنا پڑا۔

"تو کیا علی مراد۔"

"ہاں علی مراد ہی ڈاکٹر علی ہے۔" وہ اطمینان سے بولی۔

"کیا آپ شروع سے جانتی تھیں؟" مریم کی عجیب حالت ہو رہی تھی اس نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے اس کے ہاتھوں کو تھپکا پھر کہنے لگی.....

"جب وہ عابدہ کے سسرال والوں کے ساتھ پہلی بار تمہارے گھر آیا تھا۔ اس روز میں نے اُسے دیکھ لیا تھا۔"

"پھر آپ نے ہمیں بتایا کیوں نہیں تھا۔"

"اُس وقت میں نے کوئی خاص ضرورت نہیں سمجھی تھی لیکن جب میں نے تمہیں اُس کے ساتھ دیکھا تب میں نے تم سے پوچھا تھا اور تمہیں کیونکہ اس کے شادی شدہ ہونے پر کوئی اعتراض نہیں تھا اس لیے میں نے نہیں بتایا۔ کیونکہ میں نہیں چاہتی تھی کہ تم اُسے محض میری وجہ سے ریجیکٹ کرو۔ مجھے تو ویسے بھی اُس کے ساتھ نہیں رہنا تھا۔ ہاں اگر اس میں کوئی اور بُرائی ہوتی تب میں ضرور بتاتی اور تمہیں منع بھی کرتی کہ اُس سے مت ملو۔"

"لیکن باجی!" مریم کی سمجھ میں نہیں آیا کیا کہے۔

"خوامخواہ پریشان مت ہو۔" وہ اسے سمجھاتے ہوئے بولی۔ "کیا تمہیں یاد نہیں ہے۔ میں نے خود تم سے کہا تھا کہ مجھے خوشی ہے، علی مراد نے ایک اچھی لڑکی منتخب کی ہے۔ اس طرح یقین رکھو۔ علی مراد بھی بہت اچھا ہے۔"

"لیکن.....!"

"میرے حوالے سے مت سوچو مریم! بلکہ مجھے درمیان میں لاؤ ہی مت۔ ورنہ میں کہوں گی کہ میں نے تمہیں بتا کر غلطی کی حالانکہ میں نے محض اس لیے تمہیں بتایا ہے تاکہ بعد میں کسی اور کی زبانی سن کر تمہیں دکھ نہ ہو۔"

"مجھے اب بھی دُکھ ہو رہا ہے۔"

"بے وقوف ہو تم۔ دکھ کی بات تو جب ہوتی جب تم نے انجانے میں میرے حق پر ڈاکا ڈالا ہوتا جبکہ یہاں ایسی کوئی بات ہی نہیں ہے تو پلیز، تم اپنے آپ کو مجرم مت محسوس کرو۔"

وہ مسکرا کر اسے انجانے احساس سے نکالنے لگی۔ جب کہ مریم بالکل خاموش ہو گئی تھی۔

پھر زیادہ دن نہیں گزرے تھے کہ اسے علی مراد کی طرف سے رجسٹری موصول ہوئی۔

اس نے عجلت میں لفافہ چاک کیا تو پہلے کچھ کاغذات ہاتھ آئے۔ وہ بغور دیکھنے لگی اور دھیرے دھیرے اس کے آس پاس سناٹا پھیلتا چلا گیا۔ حالانکہ یہ شروع سے طے تھا اور اب تو وہ ان کاغذات کی منتظر بھی تھی پھر بھی اس کی آنکھوں میں نمی اتر آئی۔ اس نے بہت خاموشی سے ان کاغذات کو تکیے کے نیچے کھسکا دیا اور تہ شدہ کاغذ کھول کر پڑھنے لگی۔

زینب شاہ! میں نے تمہاری آواز برادری والوں تک پہنچادی ہے۔ بڑوں کے بارے میں مت پوچھو، سب حیران ہیں اور ہمارا مقصد سب کو حیران کرنا تو نہیں تھا بلکہ ہم تو انہیں یہ بتانا چاہتے تھے کہ ان کے غلط فیصلے ہماری زندگیوں پر کس طرح اثر انداز ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ ہم نوعمر لڑکیوں کی آنکھوں سے وحشتیں بھی سمیٹنا چاہتے تھے۔ کبھی آؤ تو دیکھنا، اب ان آنکھوں میں کیسے البیلے سہانے خواب سجے ہیں۔ طلاق کے کاغذات بھجوا رہا ہوں۔ اس نام نہاد بندھن کو توڑنے کے ساتھ یہ دعا بھی ہے کہ آئندہ زندگی میں تم بہت خوش رہو۔ زندگی کے خوبصورت راستوں میں تمہیں ایسا ہمسفر ملے۔ جو تمہارے مزاج کے سب موسموں کا ساتھی ہو۔

اُس کی آنکھوں میں ٹھہری نمی چپ چاپ پلکوں سے نیچے تک چھلک آئی جسے انگلیوں پر سمیٹ کر اس نے بہت آہستگی سے اپنا سر بیڈ کی پٹی پر رکھ لیا۔ خوشیاں اس کے دروازے پر دستک دے رہی تھیں لیکن اس نے سوچا۔ پہلے اسے اپنے اندر کی آزردگیوں کو سمیٹ لینا چاہیے۔ بندھن خواہ کوئی بھی ہو، کیسا بھی ہو، ٹوٹ جائے تو دُکھ تو ہوتا ہی ہے۔

☆☆☆